پیراسائیکالوجی

خواجہ شمس الدین عظیمی

پیراسائیکالوجی

خواجہ شمس الدین عظیمی

انتساب

روحانی طالب علموں

کے نام

عرض ناشر

ممتاز روحانی اسکالر مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ نے بیس سال پہلے نوع انسانی کو پر سکون زندگی سے آشنا کرنے کے لئے ایک تحریک کا آغاز کیا تھا۔اس سلسلے میں انہوں نے قومی اخبارات میں کالم لکھے، کتابیں تصنیف کیں۔روحانی ڈائجسٹ کراچی پاکستان اور روحانی ڈائجسٹ انٹرنیشنل اردو، انگلش برطانیہ سے جاری کیا۔

پاکستان کے چھوٹے بڑے شہروں اور برطانیہ، امریکہ، کینیڈا، فرانس، بھارت، متحدہ عرب امارات کے ٹیلی ویژن، ریڈیو پر انٹرویو نشر ہوئے۔بڑے بڑے ہالوں میں تقریریں کیں۔

ایک مربوط اور منظم روحانی پلیٹ فارم پر پاکستان اور بیرون پاکستان ممالک میں مراقبہ ہال کے نام سے خانقاہی نظام قائم کیا۔اس وقت پاکستان اور بیرون ممالک میں ۸۳ مراکز (مراقبہ ہال) خدمت خلق میں مصروف ہیں۔

میرے مرشد کریم پر حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ کے فیض اور سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رحمت سے اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم ہے کہ ان کے پیغام کو نہ صرف اللہ کی مخلوق نے سنا بلکہ اس پر عمل بھی کیا۔نتیجے میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد پر سکون زندگی گزار رہی ہے۔

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی کے مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی رباعی کے مطابق:

ساقی کا کرم ہے میں کہاں کا مے نوش	مجھ ایسے ہزار ہا کھڑے ہیں خاموش
مے خار عظیم برخیا حاضر ہے	افلاک سے آرہی ہے آواز سروش

عظیمی بہن بھائیوں کے شب و روز سرور و کیف سے مامور ہیں۔

مرشد کریم خانوادہ سلسلہ عظیمیہ نے 1980ء سے 1982ء تک روحانی اسباق اور پیغمبرانہ طرز فکر سے متعلق جو لیکچرز دیئے ہیں ان میں سے چند لیکچرز ''پیراسائیکالوجی'' کے نام سے قارئین کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔مجھے یقین ہے کہ موجودہ اور آنے والی نسل کے لئے یہ لیکچرز مشعلِ راہ بنیں گے۔اور ان سے نوع انسانی کے علم میں قابل قدر ذخیرہ ہو گا۔میرا مشاہداتی تجربہ ہے کہ اس علمی ورثے کو اگر یکسوئی اور ذہنی تفکر کے ساتھ پڑھا جائے تو قاری کے لئے ماورائی دنیا کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

کتاب پیراسائیکالوجی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر اس کتاب کی اصل کو جو کہ مرشد کریم نے تجویز فرمائی تھی برقرار رکھا گیا ہے۔امید ہے کہ کتاب کا یہ نیا ایڈیشن آپ کو پسند آئے گا۔

میاں مشتاق احمد عظیمی
روحانی فرزند
حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی
مراقبہ ہال۔۱۵۸ مین بازار مزنگ لاہور

فہرست

تکوین اور ارشاد

جب ہم کسی علم کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس علم کو سمجھنے کے لئے دو باتیں اہمیت رکھتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ علم کی تھیوری ہمیں معلوم ہو اور اس علم کی تکمیل یہ ہے کہ ہم علم کے اس شعبے کو مظاہراتی خدوخال سے دیکھیں۔ مطلب یہ ہوا کہ علم، تھیوری اور پریکٹیکل کے مجموعے کا نام ہے۔ دیگر علوم کی طرح روحانی علوم بھی اسی بنیاد پر قائم ہیں یعنی علم کی تھیوری میں قاعدے، ضابطے، فارمولے اور ان فارمولوں کو جانچنے کے لئے پریکٹیکل کرایا جاتا ہے۔ علم دو طرح سے سیکھا جاتا ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ پہلے تھیوری معلوم کی جائے اور اس کے قاعدے اور ضابطے معلوم کئے جائیں اور اس کے بعد اس کو پرکھا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ براہ راست تجرباتی عمل شروع کیا جائے۔

مثال:

ایک آدمی استاد کی زیر نگرانی بڑھئی کا کام سیکھتا ہے اور وہ کرسی بنالیتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا آدمی پہلے اس علم کی مبادیات سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور پھر کرسی بناتا ہے۔ اس دوسرے آدمی کو یہ بات معلوم نہیں ہوتی ہے کہ کون سے درخت کی لکڑی کتنی اچھی ہے۔ اس لکڑی کے اندر پانی کا کتنا تناسب ہے۔ لکڑی کے اندر رگوں اور نسوں کا جال کتنا ہے۔ لکڑی کے ایک مربع فٹ میں کتنا وزن ہے۔ اگر اس لکڑی کو پالش کیا جائے تو کتنی چمک آئے گی۔ رنگ کیا جائے تو کیسی صورت نکلے گی۔ لکڑی کی طبعی عمر کتنی ہے۔ اس کو کیڑا لگتا ہے یا نہیں وغیرہ۔

بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ براہ راست تجزیہ کرنے والے شاگرد کو معلوم ہو جاتی ہیں۔ علم کی مبادیات کو سمجھنے والا انجینئر کہلاتا ہے۔ کرسی بڑھئی بھی بناتا ہے اور کرسی انجینئر بھی بناتا ہے لیکن انجینئر کی حیثیت بہر حال اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے۔ علم کی تیسری شکل یہ ہے کہ ایک آدمی تھیوری بھی جانتا ہے لیکن اسے کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اس صورت میں وہ آدمی جسے تجربہ ہے اس آدمی سے زیادہ باصلاحیت قرار پاتا ہے جو تھیوری تو جانتا ہے لیکن اسے تجربہ نہیں ہے۔

اللہ کریم کی بنائی ہوئی کائنات ایک منظم اور مستحکم منصوبے کے تحت قائم ہے۔ روحانیت نے کائنات کی ساخت کا علم جاننے کے لئے دو طرزیں قائم کی ہیں۔ ایک طرز یہ ہے کہ کوئی روحانی آدمی اپنے تصرف سے شاگرد کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ ایک تجرباتی آدمی بن جاتا ہے۔ لیکن اس کی حیثیت ان معنوں میں کمزور رہتی ہے کہ اگر تجربہ غلط ہو جائے یا تجربے کا تعمیری پہلو تخریب بن جائے تو وہ بے بس ہو جاتا

ہے۔ تھیوری جاننے والا اور تجربات سے واقف آدمی نہ صرف یہ کہ بگڑے ہوئے کام صحیح کر لیتا ہے بلکہ وہ اس علم میں نئی نئی ایجادات اور اختراعات بھی کرتا ہے۔ اس تمہید کا مفہوم یہ ہے کہ علم وہی ہے جو الف۔ ب۔ پ کے طریقے پر سیکھا جائے۔ پھر وہ علم تجربے میں بھی آ جائے۔ (سیدنا حضور ﷺ کے ارشاد عالی کے مطابق اور قرآن پاک کی روشنی میں) روحانی علوم کے دو شعبے ہیں ایک شعبہ پریکٹیکل ہے، وہ یہ ہے کہ روحانی استاد یا مرشد نے جو کچھ پڑھنے کو بتادیا یا کوئی شغل تلقین کر دیا، کوئی ریاضت متعین کر دی۔ مرید یا شاگرد نے مرشد کی تعمیل میں اس عمل کا ورد کرنا شروع کر دیا، جب کبھی اس کی ذہنی صلاحیت بڑھی اور اس میں اضافہ ہوا تو مرشد نے تصرف کر کے اسے کوئی چیز دکھادی۔ (شیخ نے تصرف کیا اور شاگرد یا مرید کی آنکھوں کے سامنے فرشتے آ گئے یا روح سے ہمکلامی اسے نصیب ہو گئی اور زیادہ ترقی ہوئی تو جنت کے باغات کی سیر کی اور مزید ترقی ہوئی تو اللہ کریم کی صفات کا عارف ہو گیا)۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ علم جس قانون پر قائم ہے اور جن فارمولوں پر کائنات رواں دواں ہے مرشد مرید کو علوم سے متعلق قوانین اور فارمولوں کی تعلیم دیتا ہے۔ جیسے جیسے کسی مرید کے سامنے فارمولے آتے ہیں اس کے اندر قانون کو سمجھنے اور قانون پر عمل درآمد کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہم نے تمہارے لئے چاند اور سورج کو مسخر کر دیا اور تمہارے لئے آسانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب کا سب مسخر کر دیا۔ تسخیر کے عمل کا تذکرہ قرآن پاک میں دو طرزوں میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرز میں آدمی میں اچھائی اور برائی کا تصور کسی نہ کسی طرح اپنی ذات کے گرد گھومتا ہے۔ دوسری طرز یہ ہے کہ آدمی کے ذہن میں اپنی ذات نہیں رہتی وہ اپنی ذات کی نفی کر دیتا ہے اور اس کا ذہن اللہ کریم کے اس قانون کو سمجھ لیتا ہے جس کو مشیت کہا گیا ہے۔ قرآن پاک میں اس کا تذکرہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں بیان ہوا ہے۔ ،،جس کو ہم نے عنایت کیا علم اپنی رحمت خاص سے۔،، وہ علم لدنی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام اور بندہ کشتی میں بیٹھے۔ بندے نے کشتی میں سوراخ کر دیا پھر ایک گھر میں مہمان رہے اور ایک بچے کو قتل کر دیا۔ دیوار گرنے لگی تو بغیر معاوضے کے جب کہ وہ بھوکے پیاسے تھے، اس دیوار کو بنادیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب اس بات پر اعتراض کیا تو اس بندے نے کہا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ اپنے رب کے حکم سے کیا ہے اور پھر اس بندے اور موسیٰ علیہ السلام میں جدائی ہو گئی اور موسیٰ علیہ السلام نے اس بندے سے اقرار کیا بیشک میں اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکا۔ موسیٰ علیہ السلام کا علم اس طرز سے وابستہ ہے جس طرز پر اچھائی برائی کا تصور قائم ہے اور بندے کا علم اس طرز سے وابستہ ہے جس طرز میں اللہ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہاں یہ بتانا مقصود نہیں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی حیثیت کم تھی یا اس بندے کی حیثیت زیادہ تھی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام تلاش کرتے ہوئے اس بندے تک پہنچے وہ بندہ موسیٰ علیہ السلام کی تلاش میں نہیں آیا۔

اللہ کریم سب سے بڑے قانون دان ہیں۔ جس بندے کا ذہن مشیت کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے وہ بجائے خود قانون بن جاتا ہے اور قانون پر عمل درآمد کرانا ہر بندے کے اوپر اور پوری کائنات کے اوپر واجب ہے۔ اس بندے نے گفتگو کے دوران یہ بھی بتایا کہ یہ اللہ کی حکمت ہے کہ اس نے مجھے یہ علم (تکوین) عطا فرمادیا اور آپ کو وہ علم (ارشاد) عطا فرمادیا۔ قرآن پاک میں بیان کردہ اس واقعے کے اندر تفکر کیا جائے تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہر حال میں قانون کی حکمرانی ہے۔ چونکہ یہ بندہ خود کائنات کے جاری و ساری تکوینی

قانون کا نمائندہ ہے اور جو کچھ کر رہا ہے مشیت کے تحت کر رہا ہے۔اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے راستے کی صعوبتیں برداشت کر کے اس بندے کو تلاش کیا اور اس بندے پر شریعت نافذ نہیں کی۔

امانت

اللہ خالق ہے اور رب ہے یعنی ایسی ہستی جس نے زندگی کے تمام وسائل مہیا کر کے تخلیق کیا۔اللہ نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔ پہچاننے کے لئے ضروری تھا کہ کوئی ایسی مخلوق ہو جو اللہ کو اللہ کی مرضی اور منشاء کے مطابق پہچان سکے۔ اللہ نے پہچاننے کی دو طرزیں قائم فرمائیں۔ ایک طرز یہ ہے کہ مخلوق جانتی ہے کہ ہم مخلوق ہیں اور ہمارا پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ پہچاننے کی دوسری طرز یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں کیوں پیدا کیا اور ہماری تخلیق کا مقصد اور منشا کیا ہے۔ یہ بات کہ اللہ کریم نے مخلوق کو کیوں پیدا کیا؟ اللہ کا ایک راز ہے۔ قرآن پاک اس راز پر سے پردہ ہٹاتے ہوئے فرماتا ہے کہ ہم نے جنات اور انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں۔ اپنی بندگی اور عبدیت کا اعتراف کرتے ہوئے ہمارے سامنے جھک جائیں اور بندگی کا اعتراف اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ نے یہ اقرار کر لیا کہ میری اپنی ذاتی حیثیت کچھ نہیں۔ اصل حیثیت اس ذات عظیم کی ہے جس کے سامنے جھک رہا ہوں۔ یہ طرز عام طرز ہے اور اس طرز میں پوری کائنات، جنات، فرشتے، انسان، حیوانات و جمادات سب کے سب ہم رشتہ ہیں۔ تمام مخلوق اللہ کریم کی عبادت میں مصروف ہے۔ درخت بھی عبادت کرتے ہیں، پہاڑ بھی عبادت میں مصروف ہیں۔ پرندے بھی عبادت کرتے ہیں، جنات بھی عبادت کرتے ہیں، فرشتے بھی ہمہ تن عبادت میں مشغول ہیں۔ عبادت کا ایک مفہوم یہ ہے کہ ہم علمی اعتبار سے یہ بات جانتے ہوں کہ ہمارا کوئی خالق ہے اور عبادت کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ہم مشاہداتی طور پر دیکھتے ہوں، پہچانتے ہوں۔ خالق کی بات سنتے ہوں اور اللہ کریم کی ہدایات کو براہ راست قبول کر کے ان پر عمل پیرا ہوں۔

ہم نے یہ بتایا ہے کہ علم کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک علم محض جاننا ہے اور علم کی دوسری حیثیت اس علم سے حاصل شدہ تجربات یا مشاہدات کا حاصل ہونا ہے۔ ایک علم یہ ہے کہ ہمیں ہمارے اللہ نے پیدا کیا ہے اور اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہم اللہ کریم کی عبادت کریں اور ان اعمال کو اختیار کریں جو اللہ کریم کے پسندیدہ ہیں۔ اس علم میں مشاہدہ کو دخل نہیں ہے۔ دوسرا علم وہ ہے کہ جس میں علم کی دونوں حیثیتیں قائم ہیں یعنی علم کی علمی حیثیت بھی ہوتی ہے اور علم کی تجرباتی حیثیت بھی قائم ہوتی ہے۔ تجرباتی حیثیت کو اللہ کریم نے اپنی امانت قرار دیا ہے۔

امانت کا تذکرہ آتا ہے تو انسان کی ایک منفرد حیثیت قائم ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں اللہ کریم نے بتایا ہے کہ میں کون ہوں اور اس کائنات کی تخلیق میں میری صناعی کس طرح عمل کر رہی ہے اور کائنات کا قیام کن ضابطوں، قاعدوں اور فارمولوں پر قائم ہے۔ یہ علم کی وہ

طرز ہے جو یقین بن کر مشاہدہ بن جاتی ہے۔ اللہ کریم نے قرآن پاک میں سورہ بقرہ کی پہلی آیات میں فرمایا ہے کہ یہ کتاب ان لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو متقی ہیں اور متقی وہ لوگ ہیں جو غیب کا یقین رکھتے ہیں۔ غیب کا یقین رکھنے سے مراد یہ ہے کہ وہ مشاہداتی نظر کے حامل ہوں۔ ان کے اندر وہ نظر کام کرتی ہو جو غیب بین ہے۔ جب تک انسان کے اندر مشاہداتی نظر کام نہیں کرے گی اس کے لئے کائنات تسخیر نہیں ہو گی۔ مسخر ہونے سے مراد یہ ہے کہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ زمین ایک قاعدے ضابطے کے تحت ہمیں رزق فراہم کر رہی ہے۔ ہم زمین پر مکان بناتے ہیں تو زمین مکان بنانے میں حائل نہیں ہوتی۔ زمین اتنی سنگلاخ اور سخت جان نہیں بن جاتی کہ ہم اس کے اوپر چلیں تو گرنے لگیں۔ اتنی نرم نہیں بن جاتی کہ ہم زمین کے اوپر چلیں تو ہمارے پیر دھنس جائیں۔

سورج اور چاند ہماری خدمت گزاری میں مصروف ہیں۔ ایک قاعدے اور ضابطے میں اپنی ڈیوٹی کو انجام دے رہے ہیں جو ان کے اوپر فرض کر دی گئی ہے اور اس عمل سے ہمیں اختیاری یا غیر اختیاری فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ایک تسخیر یہ ہے کہ آپ اپنے اختیار کے تحت زمین سے، سمندر سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے، چاند سے، سورج سے کام لے سکیں۔ تسخیر یہ بھی ہے کہ چاند کی چاندنی سے پھلوں میں مٹھاس پیدا ہو اور اعلیٰ تسخیر یہ ہے کہ سیدنا حضور ﷺ انگلی سے اشارہ کر دیں تو چاند دو ٹکڑے ہو جائے۔ حضرت عمر فاروقؓ دریائے نیل کو پیغام بھیج دیں:

"اگر تو اللہ کے حکم سے چل رہا ہے تو سرکشی سے باز آجا ورنہ عمرؓ کا کوڑا تیرے لئے کافی ہے۔"

ایک صاحب نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی:

"یا امیر المومنین! میں زمین پر محنت کرتا ہوں، دانہ ڈالتا ہوں اور جو کچھ زمین کی ضروریات ہیں انہیں پورا کرتا ہوں لیکن بیج سوکھ جاتا ہے۔ بہت پریشان ہوں۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"جب میرا اس طرف سے گزر ہو تو بتانا۔"

حضرت عمر فاروقؓ جب اس طرف سے گزرے تو ان صاحب نے زمین کی نشاندہی کی۔ حضرت عمرؓ تشریف لے گئے اور زمین پر کوڑا مار کر فرمایا:

"تو اللہ کے بندے کی محنت ضائع کرتی ہے جب کہ وہ تیری ساری ضروریات پوری کرتا ہے۔"

اور اس کے بعد زمین لہلہاتے کھیت میں تبدیل ہو گئی۔

مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے مجھے ایک واقعہ سنایا کہ ایک بہت بڑا نجومی سیدنا حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پتہ چلا کہ حضور ﷺ اس وقت پہاڑ پر ہیں۔ نجومی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا اور کہا۔ یا رسول اللہ ﷺ! اگر آپ ﷺ کے پیر مبارک

کے نیچے یہ پہاڑ موم ہو جائے اور پہاڑ کے اوپر پیر کا نقش آ جائے تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے بسم اللہ پڑھ کر قدم اٹھایا اور پہاڑ پر رکھ دیا۔ جیسے ہی حضور ﷺ نے پیر اٹھا کر پتھر پر رکھا۔ نجومی نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر پہاڑ کی طرف نظر ڈالی۔ پہاڑ پر پیر کا نقش موجود تھا۔ اس طرح جیسے نرم مٹی پر نقش بن جاتا ہے۔ تسخیر کا یہ عمل دیکھ کر نجومی مسلمان ہو گیا۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ وہ اپنے زمانے کا یکتا اور منفرد نجومی ہے۔ آسمان پر ایک ستارہ ہے۔ وہ ستارہ جب کسی آدمی کے سر پر براہ راست سایہ فگن ہوتا ہے تو اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ سخت مٹی نرم ہو جاتی ہے۔ میرے حساب سے اس ستارے کو اس جگہ جہاں حضور ﷺ کھڑے ہوئے تھے کئی ہزار سال بعد آنا تھا۔ میں نے جب رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی اور حضور ﷺ نے بسم اللہ پڑھ کر قدم اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ وہ ستارہ اپنی جگہ سے تیزی سے پلٹا اور لمحوں کے لئے حضور ﷺ کے اوپر سایہ فگن ہو کر واپس چلا گیا۔

تسخیر کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ آپ یہ جانتے ہوں کہ سونے میں کتنی روشنیوں کی مقداریں کام کرتی ہیں۔ اگر تانبے میں اتنی مقداروں کا اضافہ کر دیا جائے تو تانبا سونا بن جاتا ہے۔

اللہ کریم کی تخلیق میں کوئی تخلیق غیر متوازن نہیں ہے اور نہ کوئی ایسی صورت ہے کہ کائنات حادثاتی طور پر وجود میں آ گئی ہو۔ تخلیق کے تحت ہر شئے میں معین مقداریں کام کر رہی ہیں جہاں تک تخلیقی عمل کا تعلق ہے بکری بھی اسی طرح پیدا ہوتی ہے جس طرح انسان پیدا ہوتا ہے۔ بکری کو بھی اسی طرح بھوک لگتی ہے جس طرح انسان کو بھوک لگتی ہے۔ بکری کے اندر بھی پیاس کا تقاضا اسی طرح پیدا ہوتا ہے جس طرح آدمی کو پیاس لگتی ہے۔ بکری بھی اس طرح سوتی ہے جس طرح آدمی سوتا ہے اور بکری بھی اسی طرح بھاگتی دوڑتی ہے اور غذا تلاش کرتی ہے جس طرح انسان تلاش کرتا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ تخلیق کرنے والی معین مقداریں ہر مخلوق میں الگ الگ کام کر رہی ہیں۔ کہیں معین مقداریں بکری بن جاتی ہیں۔ کہیں معین مقداروں سے گدھا بن جاتا ہے۔ کہیں معین مقداروں سے آدم بن جاتا ہے۔ کہیں معین مقداروں سے پہاڑ، کہیں فرشتے اور کہیں جنتیں بن جاتی ہیں اور کہیں دوزخ کا ایندھن بن جاتا ہے۔

تخلیقی نظام

اللہ نے بحیثیت خالق کے اپنے بندوں کو ایسا علم عطا کیا ہے کہ بندے کے اندر تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہو گئی ہیں۔ اللہ نے اپنی ذات مبارک کے لئے احسن الخالقین (تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق) کا لفظ بیان فرمایا ہے۔ یعنی اللہ نے تخلیقی اختیارات اپنے علاوہ آدم کو بھی تفویض کر دیئے ہیں۔ تخلیق کرنے والی ہستی اس بات پر قدرت رکھتی ہے کہ وہ اپنی منشا اور مرضی کے مطابق جب چاہے کسی شئے کو وجود میں لے آئے۔ جب اس کا دل چاہے روک دے۔ جب اس کے مزاج کے لئے کوئی بات ناگوار گزرے تو اس چیز کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دے۔ یہی اختیارات اللہ نے آدم کو بھی دیئے ہیں۔ آدم اپنی تخلیق سے نوع انسانی کو فائدہ بھی پہنچا سکتا ہے اور نوع انسانی اس کی تخلیق (ایجادات) سے تباہ و برباد بھی ہو سکتی ہے۔ آج کے دور میں ان باتوں کو سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ ریڈیو ایک ایجاد یا تخلیق ہے۔ ہر ریڈیو کی اپنی ایک طاقت ہے اس کا نام میڈیم ویو، شارٹ ویو، یا فریکوئنسی ہے، نام کچھ بھی ہو بہر حال وہ طاقت ان پرزوں کے اوپر منحصر ہے جو ریڈیو کے اندر نصب ہیں۔ اس طرح ٹی وی ہے اس کے اندر بھی چینل کام کرتا ہے اور اس کی طاقت کا دار و مدار ان مقداروں (لہروں) پر ہے جس کا نام چینل رکھا گیا ہے۔ ایٹم بم کے اندر بھی طاقت کا ایک ذخیرہ ہے۔ ایٹم بم میں موجود یورینیم کے الیکٹران میں کمی یا زیادتی کر دی جائے تو بہت قوی توانائی پیدا ہوتی ہے۔ اور اس توانائی سے پوری پوری آبادیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ دوسرا ہائیڈروجن بم جس کے پھٹنے سے لاکھوں آدمی مر جاتے ہیں۔ غور و فکر کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایٹم بم بجائے خود ایک طاقت ہے اور اس طاقت کی مقداروں کو کم یا زیادہ کیا جا سکتا ہے۔

صحت مند آدمی زیادہ کام کرتا ہے۔ زیادہ دوڑ سکتا ہے اور حرکات و سکنات میں چستی اور جوانمردی کا بہتر طریقے پر مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس بیمار، ضعیف و ناتواں آدمی کی چال میں، گفتگو میں، حرکات و سکنات میں نمایاں کمی نظر آتی ہے۔ بات وہی ہے کہ صحت مند اور جواں مرد کے اندر صحت کی معین مقداریں اپنی صحیح حیثیت میں متحرک ہوتی ہیں اور بیمار آدمی کے اندر صحت کی مقداریں کمزور، ٹوٹی ہوئی اور بکھری ہوئی ہوتی ہیں۔

ہمارے سامنے دو آدمی ہیں۔ ایک آدمی ذہین ہے ایک آدمی سیدھا سادہ ہے۔ ذہین آدمی کے اندر عقل و شعور کی مقداریں زیادہ کام کر رہی ہیں۔ سیدھے سادے آدمی کے اندر عقل و شعور کی مقداریں کم کام کر رہی ہیں اس لئے وہ سیدھا سادہ ہے۔ اسی طرح دو آدمی ہمارے سامنے اور ہیں۔ ایک نارمل ہے اور دوسرے آدمی کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ یہ پاگل ہے۔ مخبوط الحواس ہے۔ زندگی کے تقاضے

پورے کرنے والی معین مقداریں اور وہ مقداریں جو آدمی کے اندر حواس بناتی ہیں اگر صحیح طریقے پر متحرک ہیں تو ایسا آدمی عقلمند کہلاتا ہے۔ صحیح مقداریں غیر متوازن ہو جائیں تو ایسا آدمی کم عقل ہوتا ہے۔

ہمیں پیاس لگتی ہے یعنی ہمارے اندر تخلیقی نظام اطلاع دیتا ہے کہ اب جسمانی نظام کو پانی کی ضرورت ہے۔اعتدال پسند آدمی اتنا پانی استعمال کرتا ہے جتنے پانی کی ہمارے جسمانی نظام کو ضرورت ہے۔ غیر اعتدال پسند آدمی اتنا پانی استعمال کرتا ہے کہ پیٹ پھول جاتا ہے۔اس کی ایک طبعی شکل یہ بنتی ہے کہ پیاس کا احساس جن معین مقداروں پر قائم ہے وہ ٹوٹ جاتا ہے اور جس وقت آدمی طبعی طور پر غیر متوازن ہو جاتا ہے۔پیاس کا احساس بھی ایب نارمل ہو جاتا ہے۔استسقاء کا مریض پانی پینا شروع کرتا ہے یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھٹ جاتا ہے اور وہ مر جاتا ہے۔آدمی کو بھوک لگتی ہے،اعتدال میں کھانا کھاتا ہے تو آدمی کی جسمانی زندگی کی نشوونما ہوتی ہے لیکن اگر بھوک کا یہی تقاضا اپنی معین مقداروں پر قائم نہ رہے تو آدمی کھانا کھانے سے بیمار ہو جاتا ہے۔ یا کھانا کھانے سے ضعیف اور ناتواں ہو جاتا ہے۔ان مثالوں سے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ آدمی میں جو حرکت ہے،زندگی میں جتنے رخ ہیں اور زندگی جن خدوخال پر رواں دواں ہے وہ دنیاوی زندگی ہو یا اس دنیا کی زندگی ہو جسے غیب کی دنیا کہا جاتا ہے۔ مقداروں پر قائم ہے۔ جب تک مقداریں قائم ہیں زندگی،زندگی ہے اور جب ان مقداروں میں ردوبدل ہوتا ہے یا زیادتی ہوتی ہے یا کمی ہوتی ہے حرکت میں فرق آجاتا ہے تو زندگی میں ایسا شگاف پڑ جاتا ہے کہ بظاہر آدمی زندہ نظر آتا ہے لیکن باطن میں وہ آدمی کچھ بھی نہیں ہوتا۔نہ زندوں میں اس کو شمار کیا جاتا ہے اور نہ اس کا شمار مردوں میں ہوتا ہے۔

تسخیر کائنات کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں تخلیق کے وہ فارمولے معلوم ہوں جن کے اوپر یہ تخلیق قائم اور متحرک ہے یا حواس وباشعور ہے۔

قانون:

زندگی کا ہر تقاضا معین مقداروں سے مرکب ہے اور یہ معین مقداریں ہی تقاضے تخلیق کرتی ہیں۔زندگی کا کوئی تقاضا فارمولوں کے بغیر قائم نہیں ہے۔

اللہ کریم نے ہماری تخلیق فارمولوں سے کی ہے اور انہی فارمولوں کو ہم دانستہ یا نادانستہ متحرک کر لیتے ہیں تو نئی نئی ایجادات اور تخلیقات وجود میں آجاتی ہیں۔

چونکہ آدمی بجائے خود ایک فارمولا ہے۔اس لئے فارمولے کے اندر وہ تخلیقی عناصر جنہوں نے فارمولے کو زندگی بخشی ہے متحرک ہیں۔آدمی چونکہ ایک تخلیقی فارمولا ہے اور اسے تخلیقی فارمولوں کا علم بھی دیا گیا ہے۔اس لئے وہ ان فارمولوں کا علم سیکھ لیتا ہے جن فارمولوں سے فرشتوں کی تخلیق ہوتی ہے اور جن فارمولوں سے جنت بنائی گئی ہے اور جن مقداروں (فارمولوں) پر سات آسمان قائم ہیں۔نور اعلیٰ نور جن فارمولوں سے عرش وجود میں آیا ہے وہ بھی ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر تجسس، تلاش اور تفکر ختم ہو گیا ہے۔ مسلمان دعویٰ یہ کرتا ہے کہ میں اللہ کا نائب ہوں۔ جب کہ چیونٹی سے زیادہ عقل و تفکر استعمال نہیں کرتا۔ اللہ کریم کا قانون جاری و ساری ہے۔ قرآن پاک میں اللہ کریم نے فرمایا کہ یہ کتاب ان لوگوں کے اوپر ہدایت کے دروازے کھولتی ہے جو تفکر کرتے ہیں۔ تحقیق و تلاش کرتے ہیں۔ ریسرچ کرتے ہیں۔ گہرائی میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ اللہ کی ذات واحد ہے، ذی احتیاج نہیں ہے۔ نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ ہی اس کا کوئی خاندان ہے۔ جو تلاش کرتا ہے پالیتا ہے اور جو کفران کرتا ہے وہ محروم رہ جاتا ہے۔

نقطہ کھلتا ہے

جب کوئی بندہ کسی ایک نقطہ پر اپنی پوری صلاحیتیں مرکوز کر کے غور کرتا ہے تو اس کی نظر میں اتنی وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس نقطے کو جس کے اوپر تمام صلاحیتیں مرکوز ہو گئی ہیں پڑھ لیتا ہے۔ پڑھنے سے منشا یہ ہے کہ نقطے کے اندر موجود اوصاف اور نقطے کے اندر موجود خفیہ صلاحیتیں اور صلاحیتوں کے اندر مخفی صلاحیتیں اس کے سامنے آجاتی ہیں۔ جب اور زیادہ گہرائی میں دیکھتا ہے تو نقطہ اس کو اپنا استعمال بتا دیتا ہے۔ نقطے کے اندر موجود مخفی قوتیں اس بات کا مشاہدہ بن جاتی ہیں کہ پوری پوری کہکشائیں ہمارے ساتھ سفر کر رہی ہیں۔ ہم جان لیتے ہیں کہ دنیا میں موجود ہر شئے لہروں پر قائم ہے۔ ہم اور پوری کائنات لہروں کے تانے بانے سے مرکب ہے۔ دنیا کی ہر چیز چاہے وہ پانی ہو، درخت ہو، پتھر ہو، انسان ہو، چرندہ ہو، پرندہ ہو، درندہ ہو، انرجی ہو، آکسیجن ہو یا ایٹم یا مالیکیول روشنیوں کے ہالے میں بند ہے۔ یعنی ہر چیز کے اوپر روشنی کا ایک غلاف ہے۔ تفکر کرنے کے بعد اس بند غلاف کو کھول کر اس چیز کے اوپر نظر مرکوز کر دی جائے تو نظر کے سامنے پہلا انکشاف طاقت کا ہوتا ہے۔ نظر میں جب گہرائی پیدا ہوتی ہے تو دوسرا انکشاف اس طاقت کے استعمال کا ہوتا ہے۔ مزید گہرائی واقع ہو جانے سے تیسرا انکشاف یہ ہوتا ہے کہ طاقت مظہر بن کر سامنے آجاتی ہے۔

ہیروشیما اور ناگاساکی کے اوپر ایٹم بم گرایا گیا تو ایٹم کی طاقت کا مظاہرہ ہوا۔ مظاہرہ اس شکل میں ہوا کہ جن پہاڑیوں پر بم گرایا گیا تھا وہ پہاڑیاں دھواں بن گئیں۔ لوگوں نے دیکھا کہ پہاڑ کھڑے ہیں جب پہاڑ کو چھوا گیا تو دھوئیں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ طاقت کا کھوج کس نے لگایا؟ طاقت کا استعمال کس نے کیا؟ اور طاقت کے مظاہرے سے کون متاثر ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایٹم کی طاقت کا کھوج انسانوں نے لگایا، اس کی طاقت کو استعمال انسانوں نے کیا اور اس طاقت کے تخریبی اور تعمیری پہلو سے بھی انسان ہی متاثر ہوا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ایٹم کے اندر موجود طاقت اللہ کریم کی تخلیق ہے اور اس طاقت کو استعمال کرنے کا طریقہ اللہ نے انسان کو سکھا دیا۔

لاشعور بتاتا ہے کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے اتنی سکت اور صلاحیت منتقل کر دی ہے کہ وہ ایٹم کی طاقت کو اپنے ارادے اور اپنی منشا کے مطابق استعمال کر سکتا ہے۔ یہ کہنا ہرگز بے جا نہ ہو گا کہ خالق ہر حال میں تخلیق سے زیادہ باصلاحیت باوصف اور باہمت ہے۔

ایٹم کی طاقت کے خالق کی حیثیت سے جب ہم انسانی کردار پر نظر ڈالتے ہیں تو دراصل ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی مخفی صلاحیتیں اور قوتیں عطا کر دی ہیں جس کے سامنے ایٹم کی قوت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ فرق صرف ایٹم کے استعمال کا ہے۔ ہم

ایٹم کے اندر ان لہروں کو تلاش کرتے ہیں جو تباہی بربادی کا پیش خیمہ ہیں یا ان صلاحیتوں کو تلاش کرتے ہیں جو نوع انسانی کی تعمیر میں کام آتی ہیں۔

جب ہر چیز لہروں پر قائم ہے تو انسانی وجود بھی لہروں سے بنا ہوا ہے۔ لہروں میں قائم وجود میں تفکر انسان کے اوپر منکشف کردیتا ہے کہ انسان میں تخلیقی صلاحیت موجود ہے۔ جس طرح ایٹم ایک نقطہ ہے اور اس نقطہ کے اندر ایسی طاقت محفوظ ہے کہ اگر انہیں تخریبی ذہن سے استعمال کیا جائے تو زمین الٹ پلٹ جاتی ہے۔ پورے پورے شہر آناً فاناً تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ اس ہی ایٹم کو اگر تعمیر میں استعمال کیا جائے تو بجلی ایجاد ہو جاتی ہے۔ وہ بجلی جو ہر سائنسی ترقی میں کسی نہ کسی طرح موجود ہے۔

انسان کے اندر بھی ایک ایٹم ہے۔ اس ایٹم یا نقطے کے اندر بھی بے شمار طاقتیں ذخیرہ ہیں۔ جب یہ ایٹم کھلتا ہے تو آدمی مادی وسائل سے بے نیاز ہو کر روحانی طور پر ان فارمولوں کا مشاہدہ کرلیتا ہے جن فارمولوں سے سورج بنتے ہیں، چاند وجود میں آتے ہیں۔ جن فارمولوں پر ستارے قائم ہیں، جن فارمولوں پر آسمان قائم ہیں۔ جن فارمولوں اور کلیوں کے اوپر زمین گردش کررہی ہے۔

مثال:

ہم شربت بناتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ پانی میں چینی گھول دی جائے تو شربت بن جاتا ہے اور اس شربت میں خوشبو ملا دی جائے تو شربت خوشبودار اور مفرح ہو جاتا ہے۔ اسی شربت میں رنگ آمیز کردیا جائے تو شربت خوش شکل ہو جاتا ہے۔ اسی شربت میں اگر کوئی ایسی ٹھنڈی دوا شامل کردی جائے جو خون کو ٹھنڈا کردے تو یہ شربت گرمی سے پیدا ہونے والے امراض کا علاج بن جاتا ہے۔

روٹی پکانا ایک فارمولے کے اوپر قائم ہے۔ جب ہم روٹی کا تذکرہ کرتے ہیں تو روٹی سے متعلق جتنے اعمال ہیں وہ خود بخود زیر بحث آ جاتے ہیں۔ روٹی کا مطلب ہے زمین کے اندر گیہوں ڈالنا، زمین کی کوکھ میں دور کرنے والی روشنیوں اور لہروں کا گیہوں کے بیج پر اثر انداز ہونا، گیہوں کے بیج کے اندر موجود روشنیوں اور لہروں کا زمین کی لہروں اور روشنیوں سے باہم مل کر ایک دوسرے کا تاثر قبول کرنا۔ ایک دوسرے کے اندر لہروں کا جذب ہونے کے بعد گیہوں کے بیج میں کلہ پھوٹنا، بیج کی پیدائش کے بعد زمین کی کوکھ سے باہر آنا، سورج کی تپش سے پکنا، چاند کی چاندنی سے گیہوں کے اندر مٹھاس پیدا ہونا، گیہوں کے بیج کا جوان ہونا اور پھر اس کا چکی میں پسنا۔ آٹا بننا۔ آٹے اور پانی کے ملاپ سے ایک نئی شکل اختیار کرنا۔ آٹا اور پانی کے ملاپ سے جو مرکب بنا ہے اس مرکب کا آگ پر پکنا۔ ان تمام عوامل سے گزر کر روٹی پکتی ہے۔ ایک عام آدمی کہتا ہے روٹی کھاؤ۔ بات ختم ہوگئی لیکن تفکر کرنے والا بندہ یہ تلاش کرتا ہے کہ روٹی کیا ہے اور کیسے وجود میں آئی؟ اس ہی طرح انسان بھی ایک نقطہ ہے۔

نقطے کو توڑا جائے بالکل اس طرح جس طرح ایٹم کو توڑ دیا گیا ہو تو اس کے اندر وہ عجائبات نظر آتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے کائنات کہا ہے۔ انسان کی پوری نسل، انسان کی پوری نوع، جنات اور جنات کی پوری نوع، فرشتے، آسمان، جنت، دوزخ، عرش اور انتہا یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اس نقطے کے اندر موجود ہے جب یہ نقطہ کھلتا ہے تو انسان مشاہداتی طرزوں میں قدم قدم سفر کرکے منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے اور مقصود اور منظور و مطلوب اللہ تعالیٰ ہے۔ تصوف میں اس نقطے کا نام ''فواد'' ہے۔ جس کا ترجمہ دل ہے۔ یہ وہی دل ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے

اپنا مسکن اور اپنا گھر قرار دیا ہے۔ یہ وہی دل ہے جو کبھی غلط بیانی نہیں کرتا، کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ جو کچھ دیکھتا ہے حقیقت دیکھتا ہے۔ دل خالق کائنات کو دیکھتا ہے اور خالق کائنات دل کو دیکھتا ہے۔

رشتہ داری

ہر مخلوق دوسری مخلوق کے ساتھ باہم مشترک ہے۔اور ایک رشتے میں منسلک ہے۔ جس طرح آدم کے اندر روح کام کرتی ہے اور اس روح کی تحریکات سے ہر آدم کی زندگی میں حواس بنتے ہیں،وہ جذبات واحساسات سے گزرتا ہے۔ مسرت وشادمانی اور رنج والم کی کیفیات سے وہ متاثر ہوتا ہے۔اسی طرح چیونٹی کے اندر بھی جذبات واحساسات موجود ہیں۔ معاش کے حصول کے لئے جس طرح آدم زاد جدوجہد کرتا ہے اسی طرح چیونٹی بھی جدوجہد کرتی ہے۔ مکھی بھی جدوجہد کرتی ہے۔ مچھر بھی جدوجہد کرتا ہے۔ اگر آدم کی تربیت زیر بحث آئے تو اللہ کی دوسری مخلوق بھی اپنی اولاد کی تربیت میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتی۔ شیر اپنے بچے کو فطری اور جبلی تربیت دیتا ہے۔ بلی اپنے بچوں کی تربیت کرتی ہے اور انہیں معاش حاصل کرنے کے لئے وہ تمام قاعدے وضابطے اور گر بتا دیتی ہے جو اس کی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ آدم کی فضیلت اگر اس بات میں ہے کہ وہ عقلمند ہے تو تجربہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دوسری مخلوق کے افراد میں بھی عقل موجود ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ عقل کسی مخلوق میں کم ہو اور کسی مخلوق میں زیادہ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم شہد کی مکھی پر وحی کرتے ہیں۔ وحی کے لئے ضروری ہے کہ جس پر وحی کا نزول ہو رہا ہے وہ سعادت مند ہو، ہوش وحواس رکھتا ہو،اس کے اندر سوچنے سمجھنے اور فکر کرنے کی صلاحیت موجود ہو، وہ وحی کے مفہوم سے آشنا ہو کر اس کے مطابق عمل کر سکے۔ جب ہم اللہ رب العزت کا ارشاد پڑھتے ہیں کہ ہم نے شہد کی مکھی پر وحی کی تو ہم جان لیتے ہیں کہ شہد کی مکھی میں عقل موجود ہے۔ شہد کی مکھی میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے اور شہد کی مکھی وحی کے مفہوم سے بھی باخبر ہے۔ اگر انسان کو عقل کی بنیاد پر فضیلت دی جائے تو شہد کی مکھی بھی افضل واعلیٰ ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ محض علم وحکمت، دانائی اور عقل وشعور کی بنیاد پر انسان کو دوسری قوتوں میں شرف حاصل نہیں ہے۔ کائنات میں موجود ہر شئے زندہ ہے، متحرک ہے اور جب زندہ ہے تو اس کے اندر شعور ہے، اس کے اندر حواس ہیں، اس کے اندر زندگی گزارنے کے تقاضے موجود ہیں۔

وہ اپنی بھلائی یا برائی کا احساس رکھتا ہے۔ سردی بلی کو بھی لگتی ہے، سردی انسان کو بھی لگتی ہے۔ اگر کوئی انسان مکان بنا کر یا اعلیٰ سے اعلیٰ لباس پہن کر سردی کا تدارک کر لیتا ہے تو بلی بھی سردی سے بچاؤ کے طریقے جانتی ہے۔

اللہ کریم نے انسان کو اپنی نیابت کے علوم سکھا کر جو شرف عطا کیا ہے وہ کیا ہے؟ وہ شرف قرآن پاک کے اندر تفکر کرنے سے سامنے آتا ہے۔ آدم اور فرشتوں کا جب موازنہ کیا جاتا ہے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ آدم اسمائے الٰہیہ کے اسرار اور رموز جانتا ہے جو فرشتے

نہیں جانتے۔ یہاں ایک بات بہت زیادہ وضاحت طلب ہے کہ اسماء سے مراد یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو بتادیا ہے کہ اس چیز کا نام درخت ہے، اس کا نام فاختہ ہے، اس کا نام شیر ہے۔ حقیقت کبھی نہیں بدلتی ہمیشہ ایک نقطے پر قائم رہتی ہے۔ اگر اسماء سے مراد دنیاوی چیزوں کے نام ہوتے تو پوری نوع انسانی ہر چیز کو ایک ہی نام سے جانتی اور پہچانتی جبکہ ایسا نہیں ہے بلکہ کوئی آدمی درخت کو درخت کہتا ہے اور کوئی درخت کو Tree کہتا ہے۔ اسماء سے مراد اللہ کی وہ صفات ہیں جو خالقیت کے روپ میں تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اسماء کا علم وہ علم ہے جو کائنات کے اندر تخلیقی فارمولے ہیں۔ اسماء الٰہیہ وہ علم آگہی ہے جو انسان کے اوپر اس عالم کو منکشف کرتا ہے۔ جس عالم میں غیبی انکشافات ہیں جس عالم میں قدرت الٰہیہ کے وہ راز ہیں جن کے اوپر پوری کائنات قائم ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''ہم نے اپنی امانت سماوات پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی سب نے کہا ہم اس کو اٹھانے کے متحمل نہیں ہو سکتے اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ اگر یہ امانت ہم نے اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھائی تو ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور ہمارا وجود نیست و نابود ہو جائے گا۔''

آیت مقدسہ میں پوری طرح اس قانون کی وضاحت کی گئی ہے کہ سماوات بھی شعور رکھتے ہیں۔ ارض بھی شعور رکھتی ہے، پہاڑ بھی شعور رکھتے ہیں۔ انکار یا اقرار بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ انکار یا اقرار کرنے والی ہستی میں شعور موجود ہے۔ اگر پہاڑ کے اندر جسے بے جان پتھر سمجھا جاتا ہے عقل نہ ہوتی سمجھ بوجھ نہ ہوتی، اسے اپنی ہستی کا ادراک نہ ہوتا تو وہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ میں یہ امانت نہیں اٹھا سکتا۔ اگر میں نے اس امانت کو اٹھالیا تو میں ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا۔ تفکر کرنے سے مزید وضاحت ہوتی ہے کہ جس طرح انسان سنتا ہے، پتھر بھی سنتا ہے، جس طرح انسان سوچتا ہے پتھر بھی سوچتا ہے۔ جس طرح انسان بولتا ہے پتھر بھی بولتا ہے۔ یہ قرآن پاک کی آیات ہیں کوئی عقلی اور فلسفیانہ استدلال نہیں ہے۔ ذرا غور کیجئے جب پتھر بول سکتا ہے، سن سکتا ہے، اپنی ہستی کے بارے میں اسے علم ہے کہ میرے اندر کتنی سکت ہے اور وہ کسی غلط فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہے۔ وہ اپنے بارے میں صحیح صحیح اندازے بھی رکھتا ہے تو پھر انسان اس سے کیسے اشرف ہوا؟

اللہ کریم یہ بھی فرماتے ہیں:

''اس امانت کو انسان نے قبول کر لیا ہے۔ بے شک یہ ظالم اور جاہل ہے۔''

اس کا مفہوم یہ ہوا کہ سماوات ارض اور پہاڑ ظالم اور جاہل نہیں ہیں۔ انسان ظالم اور جاہل ہے۔ اس لئے ظاہم اور جاہل ہے کہ اس نے بغیر سوچے سمجھے کہ میں اس امانت کا تقاضا بھی پورا کر سکتا ہوں یا نہیں؟ کوتاہ بینی اور اپنی نادانی میں امانت الٰہیہ کو قبول کر لیا لیکن چونکہ اس نے قبول کر لیا ہے اس لئے اشرف المخلوقات کے دائرے میں داخل ہو گیا۔ اشرف المخلوقات کے دائرے میں کوئی انسان جب ہی داخل ہو سکتا ہے جب اس امانت سے باخبر ہو۔ اگر وہ امانت سے بے خبر ہے تو وہ ہرگز اشرف المخلوقات نہیں ہے۔ اس کی حیثیت دوسری مخلوقات سے نا صرف یہ کہ کم ہے بلکہ بدتر ہے۔ جو بندہ اللہ کی امانت سے بے خبر ہے وہ ظالم اور جاہل ہے۔ یہی اللہ کریم کا ارشاد ہے۔ انسان امانت کے علم کے بغیر جاہل اور سرکشوں کے گروہ میں تو داخل ہو سکتا ہے اشرف المخلوقات نہیں بن سکتا۔

فرشتے اور انسان

موجودہ دور میں سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ اب اس بات کی تصدیق ہوگئی ہے کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی بے شمار دنیائیں موجود ہیں۔ جس چیز کو ہم خلاء کہتے ہیں اس خلاء میں بستیاں آباد ہیں۔ سیارے ہیں اور ہر سیارہ ہماری زمین کی طرح آباد ہے۔ لیکن ہم ان سیاروں کو اور خلاء میں بسنے والی آبادیوں کو دیکھ نہیں سکتے۔ ابھی تک سائنس نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک قیاس ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے لیکن آدم اور اللہ کی گفتگو ہمارے اوپر یہ راز منکشف کررہی ہے کہ نوع انسانی کے علاوہ ایک مخلوق ہے جسے فرشتہ کہتے ہیں۔

دوسری مخلوق ہے جن یا جنات۔ ہم نہ جنات کو دیکھ سکتے ہیں نہ فرشتوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ جنات اور فرشتوں کی دنیا سے ہم اس لئے متعارف نہیں ہیں کہ ہم اس نظر سے واقف نہیں جو نظر فرشتوں اور جنات کو دیکھتی ہے۔ دیکھنے کی طرزوں پر تفکر کیا جائے تو یہ بات روزمرہ کے مشاہدے میں ہے کہ ہماری نظر ایک متعین حد میں کام کرتی ہے لیکن اگر نظر کی متعین حدود کو توڑ دیا جائے اور کسی طرح اس میں اضافہ کردیا جائے تو نظر عام حالات میں جتنا دیکھتی ہے اس سے زیادہ فاصلے کے مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

مثلاً ہم آنکھوں پر دوربین لگا لیتے ہیں۔ دوربین کے اندر جو شیشے لگے ہوئے ہیں وہ ان طول موج کو جو نظر کے لئے دیکھنے کا باعث بنتے ہیں آنکھوں کے سامنے لے آتے ہیں اور ہم میلوں فاصلے کی چیز دیکھ لیتے ہیں۔ کسی آدمی کی نظر کمزور ہے سامنے کی چیز اسے نظر نہیں آتی اور چشمہ لگانے کے بعد وہ دور تک دیکھ لیتا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟ مطلب یہ ہوا کہ شیشے کے اندر اتنی صلاحیت موجود ہے کہ اگر آپ اس کا Magnified بڑھائیں تو آپ کی نظر دور تک دیکھ سکتی ہے۔ جب آپ شیشے کے ذریعے سے میلوں دور دیکھ لیتے ہیں تو اس آنکھ سے جس آنکھ نے فرشتوں کو دیکھا ہے اور اللہ کو دیکھا ہے غیب کی دنیا کو کیوں نہیں دیکھ سکتے؟ بات صرف اتنی سی ہے کہ ہمیں اپنے اندر اس آنکھ کو تلاش کرنا ہے جس آنکھ نے فرشتوں کو دیکھا ہے اور اللہ کریم کا دیدار کیا ہے۔

یہ نظر حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس حالت میں لوٹ جائیں جہاں اللہ نے آدم سے گفتگو کی تھی۔ لوح محفوظ کی تحریریں بتاتی ہیں کہ ایسا نہیں ہے کہ آدم کے اندر چند مخصوص صلاحیتیں کام کررہی ہیں اور آدم کی اولاد کے اندر یہ صلاحیتیں موجود نہیں ہیں۔ آدم و حوا کی اولاد میں ہر فرد دراصل آدم کا عکس ہے۔ تمثل ہے اور فوٹو یا پرنٹ ہے۔ ہر آدم زاد کے اندر علم الاسماء سیکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ جب تک آدم زاد کی تمام دلچسپیاں صرف مادی جسم کے ساتھ وابستہ رہتی ہیں اس کے اندر روحانی صلاحیتیں چھپی رہتی ہیں اور جب آدم زاد کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ گوشت کا جسم دراصل نافرمانی کرنے کے جرم میں ایک پردہ ہے تو اس کا ذہن حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے اور یہ تلاش اسے ان صلاحیتوں سے باخبر کردیتی ہے جن صلاحیتوں سے آدم زاد غیب کی دنیا میں سفر کرتا ہے۔

آدم کی میراث

اللہ کریم کے ارشاد کے مطابق آدم کو جو پہلا مقام عطا ہوا وہ جنت ہے۔ اللہ کریم کے اسماء یعنی اللہ کی صفات معلوم کر کے انسان کو جو پہلی نعمت حاصل ہوئی اس کا نام جنت ہے۔ اللہ کریم کی صفات اللہ کی صناعی کے لاحد و حساب نمونے ہیں۔ خالق کی صفت تخلیق ہوتی ہے چونکہ اللہ کریم خالق ہیں اس لئے اللہ کی ہر صفت ایک تخلیق ہے۔ اللہ نے آدم کو علم الاسماء سکھا کر اپنی تخلیق سے روشناس کیا۔ اس طرح روشناس کیا کہ آدم کو دوسری تمام نوع پر شرف اور فضیلت حاصل ہو گئی۔ اس شرف اور بزرگی کا پہلا انعام جنت ہے۔ یعنی اللہ کریم کے اسماء کا علم جب آدم کے اندر متحرک ہوا تو آدم نے خود کو جنت میں پایا۔ جنت ایک ایسی فضا ہے جس میں وہ آزاد ہے۔ اس فضا میں ایسے حواس کام کرتے ہیں جن میں کثافت نہیں ہے۔ کسی قسم کی الجھن یا پریشانی کو دخل نہیں ہے۔ قید و بند کی کوئی صعوبت نہیں ہے۔ تلاش و معاش کی کوئی فکر نہیں ہے۔ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کا خوف نہیں ہے۔ کسی چیز کے کھو جانے کا خوف نہیں ہے۔ جنت ایک ایسی فضا ہے جو ہر اعتبار سے سکون ہے، راحت ہے، آرام ہے، آسائش ہے۔ اس تمہید کا مفہوم یہ ہے کہ نیابت اور خلافت کی پہلی سیڑھی یہ ہے کہ جب آدمی اس منزل کی طرف قدم بڑھاتا ہے اس کے اوپر سے آلام و مصائب، ذہنی خلفشار، عدم تحفظ کا احساس، غم ناکی، بدحالی، پریشانی اور خوف کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے سامنے زندگی کا صرف ایک رخ رہتا ہے اور وہ سکون ہے، آرام ہے، آسائش ہے اور حاکمیت ہے۔ خالق کائنات چونکہ خود ہر چیز سے بے نیاز اور ہر قسم کی احتیاج سے ماوراء ہے اس لئے جب کسی بندے کے اندر خالق کی صفت صمدیت کروٹ بدلتی ہے تو اس کے اوپر وہی کیفیات وارد ہوتی ہیں جو اللہ کی اس صفت کا تقاضہ ہیں۔ آدم کو اللہ کریم نے اپنے انعام و اکرام سے نواز کر جنت میں رکھا۔ اور کہا:

اے آدم! تو اور تیری بیوی جنت میں رہو۔ جہاں سے دل چاہے خوش ہو کر کھاؤ لیکن اس درخت کے قریب مت جانا ورنہ تمہارا شمار ایسے لوگوں میں ہو گا جو اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

ہمارے باپ آدم سے صبر نہ ہو سکا اور وہ اللہ کی نافرمانی کے مرتکب ہو گئے۔ جیسے ہی ہمارے ابا آدم جی نافرمانی کے مرتکب ہوئے اللہ کی عطا کردہ امانت پس پردہ چلی گئی۔ اور یہ پردہ آدم کے لئے ایک نئی زندگی بن گئی۔ یہ نئی زندگی عارضی طور پر محرومی ہے۔ امانت یافتہ زندگی سکون و راحت کی زندگی تھی۔ جیسے ہی آدم نے اس زندگی سے رشتہ توڑا سکون و آسائش غائب ہو گئے۔ روشنی کی جگہ تاریکی نے لے لی، خوشی کی جگہ غم چھا گیا۔ آزادی کی جگہ قید و بند کی جگہ جکڑ اگیا۔ ابا آدم جی نہایت حسرت و یاس میں جنت چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ باوجود اس کے کہ ابا آدم جی نے اللہ کی نافرمانی کی اور جنت جیسی نعمت سے کفران کیا۔ اللہ کریم نے اپنی رحیمی و کریمی کی صفت سے پھر بھی ابا آدم جی

کے اوپر فضل کیااور وہ امانت جو اللہ نے انہیں عطا کی تھی سلب نہیں کی۔ ابا آدم جی نے اپنی مرضی اور اختیار سے اس کے اوپر پردہ ڈال دیا۔ یعنی اللہ کریم نے انہیں تسخیر کائنات سے متعلق جو خزانے عطافرمائے تھے ان خزانوں کے اوپر ایک دبیز پردہ ڈال کر آنکھیں موند لیں۔ اتنے بڑے ظلم، اتنی بڑی سرکشی، اتنی بڑی نافرمانی کے باوجود اللہ نے رحم فرمایااور کہا کہ اپنا وطن جنت تم اب بھی حاصل کر سکتے ہو۔ بشرطیکہ تم اپنے اوپر سے خود ساختہ نافرمانی کا پردہ ہٹا دو۔ جیسے ہی تم یہ پردہ چاک کر وگے جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ اس کے باوجود کہ تمہاری روح (تمہارا لاشعور) تمہارے اندر موجود نافرمانی کا پرت (تمہارا شعور) جو جنت سے نکالا گیا ہے اس بات کو جانتا ہے کہ میرا وطن جنت ہے۔ میری زندگی سکون، آسائش اور آزادی تھی۔ پھر بھی ہم تم میں سے ہی ایسے لوگ بھیجتے رہیں گے کہ تمہیں اس بات پر متوجہ کرتے رہیں کہ تمہارے پاس اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے جس سے تم محروم ہوگئے ہو۔ جب تم بھٹک جاؤ، بھول جاؤ اور تمہارے ذہن سے یہ بات نکل جائے کہ تم ایک عظیم خزانے کے مالک ہو۔ خزانہ ہونے کے باوجود تم مفلس اور قلاش زندگی بسر کر رہے ہو۔ ہم اپنے بندوں کو بھیج کر تمہیں ان راستوں پر چلنے کی ترغیب دلائیں گے۔ ہمارے یہ پاکیزہ قدسی نفس بندے تمہارے لئے اس راستے پر چلنے کے لئے قاعدے اور ضابطے بنائیں گے تاکہ تم آسانی کے ساتھ اس پردے سے آزاد ہو کر دوبارہ جنت میں داخل ہو جاؤ۔

یاد رکھو کہ تم جنت کے خلاف اسفل السافلین کی جو زندگی بسر کر رہے ہو یہ تمہارے لئے جیل خانہ ہے۔ یہ زندگی تمہارے لئے عذاب ہے۔ یہ زندگی نہایت عارضی ہے۔ فکشن ہے۔ کچھ بھی کرلو بالآخر یہ زندگی تمہیں چھوڑنی ہے۔ لیکن اگر تم نے اس زندگی میں اپنے اور جنت کے درمیان حائل پردے کو نہیں ہٹایا جنت تمہیں قبول نہیں کرے گی۔

جب تک تم نے زمین پر قیدی کی حیثیت سے زندگی گزاری تمہارے اندر وہ دماغ کام کرتا رہا جو نافرمانی کا دماغ ہے اور جس نافرمانی پر جنت نے تمہیں نکال باہر پھینکا ہے۔ قدرت نے اپنا کیا ہوا وعدہ پورا کیا۔ ظالم اور سرکش نافرمان آدم زاد کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر مبعوث کئے لیکن ہائے افسوس نوع انسانی نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی باتوں پر کان نہیں دھرے۔ اسی شیطان الرجیم کے کہنے پر چلتے رہے جس نے آدم کو جنت سے نکلوایا۔ ہر آدمی جو ذرا سا بھی شعور رکھتا ہے ہر وقت اس بات کا مشاہدہ کرتا ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ مر رہا ہے۔ ایک لمحہ مرتا ہے دوسرا لمحہ پیدا ہوتا ہے۔ دن مرتا ہے رات پیدا ہوتی ہے۔ رات مرتی ہے تو دن پیدا ہوتا ہے۔

بچپن مرتا ہے تو لڑکپن پیدا ہوتا ہے۔ لڑکپن مرتا ہے تو جوانی پیدا ہوتی ہے۔ جوانی مرتی ہے تو بڑھاپا پیدا ہوتا ہے اور بڑھاپا مرتا ہے تو آدمی غائب ہو جاتا ہے۔ اس طرح غائب ہو جاتا ہے کہ جس طرح خوبصورت مورتی کو مٹی تہس نہس کر دیتی ہے خوبصورت جسم انسانی کا ایک ایک عضو مٹی کے ذرات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہڈیاں جن کے اوپر انسانی ڈھانچے کا دار و مدار ہے راکھ بن جاتی ہیں۔ دماغ جس پر انسانی عظمت کا دار و مدار ہے اور جس دماغ کے اوپر انسان اکڑتا ہے دوسروں کے اوپر ظلم کرتا ہے، خود کو خدا سمجھنے لگتا ہے، اس دماغ کو بھی مٹی کھا جاتی ہے اور مٹی کے ان ذرات کو اس جیسے دوسرے انسان پیروں تلے روندتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی بندہ اس اسفل زندگی میں جنت کے اس دماغ سے متعارف ہو جاتا ہے جس کی بنیاد پر فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا ہے تو آدم زندہ جاوید ہو جاتا ہے اور اس کی میراث جنت اسے واپس مل جاتی ہے۔

اندھا آدمی

آدمی جب مر جاتا ہے تو دراصل وہ غیب کی اس دنیا میں چلا جاتا ہے جہاں اس کے اوپر سے زماں اور مکاں کی پابندیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ زماں اور مکاں ٹائم اور اسپیس کی پابندیاں ٹوٹنا الگ بات ہے اور ٹائم اور اسپیس کا ختم ہو جانا دوسری بات ہے۔ کوئی آدمی جو مرنے کے بعد اس دنیا سے اس دنیا کا ہو گیا یعنی عالم اعراف میں چلا گیا۔ اس کے ذہن میں ٹائم اور اسپیس دونوں موجود رہتے ہیں۔ جس طرح وہ یہاں زمین پر چھت کے نیچے رہنے پر مجبور ہے اور اس کے لئے خورد و نوش کا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح عالم اعراف میں بھی گھر ہونا، کھانے پینے کا سامان ہونا اور بات چیت کرنے کے لئے دوسرے لوگوں کا موجود ہونا ضروری ہے۔ مرنے کے بعد بھی آدمی ان جذبات و احساسات میں زندگی گزارتا ہے جن جذبات و احساسات میں اس دنیا میں زندگی گزار چکا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ گوشت پوست کا جسم مٹی بن جاتا ہے اور روح اس گوشت پوست کے جسم کو چھوڑ کر عالم اعراف میں ایک اور نیا جسم بنا لیتی ہے۔ جس طرح اس جسم کے ساتھ تقاضے چپکے ہوئے ہیں اسی طرح مرنے کے بعد بھی انسان کے ساتھ تمام تقاضے چپکے رہتے ہیں۔ وہاں اس کو بھوک بھی لگتی ہے، پیاس بھی لگتی ہے۔ آدم زاد بھوک پیاس کا تقاضہ رفع کرنے کے لئے کھانا بھی کھاتا ہے، پانی بھی پیتا ہے۔ اس کے اوپر غم آشنا زندگی کے تصورات بھی مرتب ہوتے ہیں اور وہ مسرت بھرے لمحات میں بھی وقت گزارتا ہے۔

بادی النظر میں اگر دیکھا جائے تو اس دنیا کی زندگی اور مرنے کے بعد کی زندگی میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ شعور کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ اتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ایک آدمی پیدل چل کر کراچی سے لندن پہنچے تو مہینوں کا وقفہ درکار ہو گا۔ لیکن اگر ہوائی جہاز میں بیٹھ جائے تو چند گھنٹوں میں پہنچ جاتا ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں یہ فرق ہے کہ یہاں آدمی ہفتوں کا سفر گھنٹوں میں گزارنا چاہتا ہے تو اسے ہوائی جہاز کی ضرورت پیش آتی ہے۔۔۔۔۔ اگر سالوں اور مہینوں کا سفر طے کرنا چاہے تو اسے ہوائی جہاز کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ اس کے لئے اس کے ذہن کی رفتار ہوائی جہاز بن جاتی ہے۔ یہ اس دنیا کا تذکرہ ہے جس دنیا میں بالآخر سب کو جانا ہے۔ اس قانون سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔ جو آدمی عالم ناسوت (مادی دنیا) میں پیدا ہو گیا خوشی کے ساتھ یا مجبوری کے ساتھ بہر حال اسے اس عالم میں جانا ہے۔

ہم خواب دیکھتے ہیں۔ عالم اعراف میں بھی کم و بیش یہی صورت واقع ہوتی ہے۔ اس بات کو ہم آسان الفاظ میں اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ عالم ناسوت کا وہ حصہ جو ہمارے لئے خواب ہے عالم اعراف میں بیداری کی زندگی بن جاتا ہے۔ مرنے کے بعد غیب اور ظاہر کے

درمیان جو پردہ حائل ہے وہ اٹھ جاتا ہے لیکن نافرمانی اور جنت کے درمیان جو پردہ حائل ہے وہ نہیں اٹھتا۔ اگر کوئی آدمی اس دنیا میں نافرمانی کے دماغ سے رستگاری حاصل نہ کر سکا تو مرنے کے بعد بھی نافرمانی کا دماغ اس کے اوپر مسلط رہتا ہے۔ جس طرح وہ اس زندگی میں رنجیدہ اور پریشان ہوتا ہے ڈرتا رہتا ہے، خوف زدہ رہتا ہے مستقبل کی طرف سے فکر مند رہتا ہے، ناخوش رہتا ہے، روتا رہتا ہے اور محرومی اپنا مقدر سمجھتا ہے اسی طرح مرنے کے بعد بھی روتا رہتا ہے، غم زدہ رہتا ہے، پریشان رہتا ہے اور حسرت و یاس کی زندگی بسر کرتا ہے۔

اللہ کریم کے بیان کردہ قانون کے مطابق نافرمانی اور فرمانبرداری کے درمیان جو پردہ حائل ہے اس کو اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اس دنیا میں ہی اپنے وطن جنت کو دیکھ لے۔ اگر آدم زاد ساری زندگی میں جنت کی زندگی سے آشنا نہیں ہوا تو مرنے کے بعد بھی اس کے اوپر جنت کے دروازے نہیں کھلیں گے۔ قرآن پاک نے دو طبقے کرکے اس بات کی وضاحت کی ہے:

''اور تم کیا سمجھے علیین کیا ہے اور تم کیا سمجھے سجیین کیا ہے۔ یہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے۔ ایسی لکھی ہوئی کتاب جس کتاب میں تمہاری زندگی کا ہر عمل ہر حرکت ہر جذبہ ہر سانس ریکارڈ ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں زندگی کا ہر رخ ہر حرکت فلم کی طرح نقش ہے۔''

انسان زندگی میں جو کچھ کرتا ہے اس کی فلم بنتی رہتی ہے۔ اگر انسان کے قدم جنت کے راستے پر اٹھ گئے اور اس نے قدم بقدم چل کر جنت کا مشاہدہ کر لیا تو یہ سب کا سب عمل صراط مستقیم پر سفر کی ایک فلم بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس کوئی بندہ صراط مستقیم سے بھٹک گیا تو اس کا ہر قدم اس راستے پر اٹھ رہا ہے جو راستہ قدم قدم چل کر آدمی کے اوپر دوزخ کے دروازے کھولتا ہے۔ مطلب یہی ہے کہ ایسے بندے کی زندگی سے متعلق جو فلم بنی اس کا اختتام دوزخ ہے۔ اپنی عمر گزارنے کے بعد جو عمر اللہ نے اپنی منشاء اور مرضی کے مطابق عطا فرمائی تھی، اسے ختم کرنے کے بعد جب بندہ اس دنیا سے اس دنیا میں منتقل ہوتا ہے تو وہ اپنی زندگی سے متعلق بنی ہوئی فلم دیکھتا ہے۔ اگر وہ اس دنیا میں جنت سے محروم ہو گیا تو وہاں وہ فلم دیکھتا رہتا ہے جو دوزخ کی طرف لے جاتی ہے اور اگر اس نے صراط مستقیم پر گامزن ہو کر خالصتاً اللہ کے قوانین کے مطابق زندگی گزار دی ہے تو وہ جنت پر مبنی فلم دیکھتا ہے اور جنت کی نعمتوں سے سیراب ہوتا رہتا ہے۔

قانون: جب تک کوئی بندہ جنت کا مشاہدہ نہیں کر لیتا اس وقت تک اس کے اندر جنت کی زندگی کا ریکارڈ نہیں ہوتا۔ اس بات کو سیدنا حضور ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

''موتو قبل انت موتو'' ''مر جاؤ مرنے سے پہلے۔''

مر جاؤ مرنے سے پہلے کا یہ مطلب نہیں کہ کھانا پینا چھوڑ کر خود کشی کر لی جائے۔ شہروں کو خیر آباد کہہ کر جنگلوں کو مسکن بنا لو۔

کپڑے اتار کر ننگے پھرنے لگو یا اولاد اور والدین سے قطع تعلق کر لو۔ مر جاؤ مرنے سے پہلے کا مطلب یہ ہے کہ اس زندگی میں رہتے ہوئے مرنے کے بعد کی زندگی سے واقفیت حاصل کر لو۔ جب کوئی بندہ مادی زندگی میں مرنے کے بعد کی زندگی سے آشنا ہو جاتا ہے تو یہ بات اس کے مشاہدے میں آجاتی ہے کہ علیین۔۔۔۔۔اعلیٰ طبقہ انعام یافتہ طبقہ ہے اور سجیین۔۔۔۔۔محروم طبقہ سزا یافتہ طبقہ ہے۔

قرآن پاک میں بیان ہوا ہے کہ اس زندگی میں اگراندھا پن ہے اور بے نور آنکھیں ہیں تو اس زندگی میں بھی اندھا پن اور بے نور آنکھیں مقدر بن جاتی ہیں۔اگراس دنیامیں آنکھیں ہیں اور ایسی آنکھیں جواللہ کے نور کا مشاہدہ کرتی ہیں تو اس دنیا کے اندر بھی مشاہدہ کرنے کی صلاحیت موجود ہوگی۔سیدنا حضورﷺ کا ارشاد ہے:''مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔''

رسول اللہﷺ نے یہ کوئی تشبیہ نہیں دی۔نور سے دیکھنا تشبیہ نہیں ہے۔پیغمبر آخر الزماںﷺ جو کچھ فرماتے ہیں وہ حقیقت ہے اور ایسی حقیقت ہے جس میں ردوبدل نہیں ہوتا۔نور کی نظر سے دیکھنے والا بندہ نورانی دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے۔اگر نور کو مشاہدہ کرنے والی آنکھ مادی دنیا میں نہیں کھلی تو مرنے کے بعد بھی آدمی اندھا رہتا ہے۔

غارِ حرا

مادی دنیا ایسی کھیتی ہے۔ جس میں آخرت کی زندگی کے کانٹے یا پھولوں کے بیج ڈالے جاتے ہیں۔ اگر کسی بندے نے شیطانی وسوسوں کے تحت اس زمین میں کانٹوں کی کھیتی بوئی ہے تو آخرت میں بھی کانٹے چننا، کانٹے توڑنا اور کانٹے کھانا اس کا مقدر ہے۔ اور کسی بندے نے اگر اس مزرعہ آخرت میں رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق اور اولیاءاللہ کی زندگی کے اعمال و وظائف کی روشنی میں ایسی کاشت کی ہے جس کاشت کے نتیجے میں سدا بہار درخت پھولدار پودے اور خوشنما باغات وجود میں آتے ہیں تو مرنے کے بعد اسکا اثاثہ یہی خوشنما باغات ہیں۔

بات سیدھی اور صاف ہے اس دنیا میں ہم جو کچھ کرتے ہیں اس کے مطابق ہم جزا کے مستحق ہوتے ہیں یا عذاب ناک زندگی ہمارے اوپر مسلط ہو جاتی ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث کے مطابق:

''مر جاؤ مرنے سے پہلے''

اس بات کی تشریح ہے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے یعنی مٹی سے وجود میں آنے والے حواس کے ساتھ یہ بات ہم جان لیں اور سمجھ لیں کہ اس دنیا کے بعد دوسری زندگی کا دار و مدار ہمارے اپنے ذاتی اختیار اور عمل پر ہے۔ قرآن پاک نے اسی بات کو بار بار ارشاد کیا ہے:

تفکر کرو، عقل و شعور سے کام لو، زمین پر پھیلی ہوئی اللہ کی نشانیوں کا کھوج لگاؤ۔ اپنی تخلیق پر غور کرو کہ کس طرح وجود میں آئے۔

کس طرح اللہ کریم نے حفاظت کے ساتھ تمہیں پرورش کیا، پروان چڑھایا، تمہارے اوپر جوانی کا دور آیا۔ تمہیں اللہ نے طاقت عطا کی ایسی طاقت کہ تم اپنے ارادے اور اختیار کے ساتھ زمین پر دوڑنے لگے۔ اور اس ہی طاقت اور اختیار کے ساتھ زمین کی کوکھ میں سے تم نے اپنے لئے وسائل تلاش کئے۔ دریاؤں میں کشتیاں چلادیں۔

علیٰ ہذا القیاس اللہ نے تم کو اتنی بڑی طاقت عطا کی کہ زمین پر پھیلے ہوئے وسائل تمہاری دسترس میں آگئے۔ یہی بندہ جو نا قابل تذکرہ شئے تھا۔ پیدائش کے بعد اس قابل بھی نہ تھا کہ اپنے ارادے سے حرکت کر سکے۔ کروٹ بدل سکے یا بیٹھ سکے۔ مکھی اڑا سکے۔ اس گوشت

پوست کے لوتھڑے کو اللہ نے اتنی سکت عطا کی کہ اس کے وجود سے اور اس کے اندر مخفی صلاحیتوں سے طرح طرح کی مصنوعات وجود میں آگئیں۔

انسان جب بجلی کی تلاش میں لگ گیا اور اس نے بجلی کو تلاش کرلیا تو اللہ کی ایک تخلیق بجلی سے لاکھوں تخلیقات وجود میں آگئیں۔

اگر بجلی کی ذیلی تخلیقات کو شمار کیا جائے تو عقل گم ہو جاتی ہے۔ اللہ کریم نے فرمایا:

''میں احسن الخالقین ہوں''

یعنی تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق ہوں۔ اس کو آپ یوں سمجھ لیں کہ بجلی کا خالق اللہ ہے۔ بجلی کی تمام ذیلی تخلیقات ریڈیو، ٹی وی، وائرلیس اور دوسری بے شمار چیزیں انسان کی تخلیق ہیں۔ جب تک انسان نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال نہیں کیا بجلی کے اندر طاقت چھپی رہی۔ اور جب انسان کے اندر جستجو نے کروٹ بدلی اور وہ ہمہ تن متوجہ ہو کر بجلی کی تلاش میں لگ گیا تو بجلی نے اپنے اندر چھپی ہوئی صلاحیتیں اس کے اوپر ظاہر کر دیں اور چھپی ہوئی ہر صلاحیت ایک تخلیق بن گئی۔

جب انسان مادے کے اندر تفکر کرتا ہے تو اس مادے کی طاقت اور توانائی کو اپنے لئے مفید بنالیتا ہے یا ضرر رساں بنالیتا ہے۔ مادی ترقی کے پس منظر میں ایک اور صلاحیت پوشیدہ ہے۔ جس کو روح کا نام دیا جاتا ہے۔ مادے کے اندر سے جو صلاحیتیں آشکار ہو رہی ہیں وہ دراصل اسی روح کا ایک ہلکا سا عکس ہے۔ ابھی ہم نے عرض کیا تھا کہ انسان اپنی زندگی میں جو کچھ بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ اس کی جو کمائی ہوتی ہے اس کے مطابق اس کو صلہ ملتا ہے۔ اگر انسانی ذہن تفکر کے ساتھ عظیم طاقت بجلی کو تلاش کر سکتا ہے تو انسان اپنے اندر اس آنکھ کو بھی تلاش کر لیتا ہے جو آنکھ زماں و مکاں سے ماوراء دیکھتی ہے۔ جس آنکھ کے سامنے اس زندگی اور مرنے کے بعد کی زندگی کے درمیان حائل پردے معدوم ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ آنکھ ہے جس سے اولیاء کرام باطنی واردات اور کیفیات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہی وہ آنکھ ہے جو کھل جائے تو کشف القبور ہو جاتا ہے۔ یعنی مرنے والوں کی روح سے آدمی اس طرح گفتگو کر سکتا ہے جس طرح عالم اسباب میں رہتے ہوئے جسمانی خدوخال سے مرکب دو آدمی گفتگو کرتے ہیں۔ یہی وہ آنکھ ہے کہ اگر اس آنکھ کی طاقت اور بڑھ جائے تو اس کے سامنے فرشتے آجاتے ہیں۔ یہی وہ آنکھ ہے جس کی برکت سے اللہ کے دوست عرش پر اللہ تعالیٰ کا دیدار کرتے ہیں۔ اس باطنی آنکھ کا کھلنا اور اس باطنی آنکھ کے سامنے سب سے پہلے جو چیز آتی ہے یہ وہ عالم ہے جس کو ہم عالم اعراف یا موت کے بعد کی زندگی کہتے ہیں۔

یعنی گوشت پوست کے جسم سے رشتہ منقطع ہونے کے بعد آدمی جس دنیا میں قدم رکھتا ہے باطنی آنکھ اس دنیا کو دیکھ لیتی ہے۔

جنت میں چلے جانا اس کے لئے معمول بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر جسمانی زندگی میں کسی بندے نے اپنی باطنی آنکھ نہیں کھولی تو اس کے اوپر محرومی مسلط ہو جاتی ہے۔ مرنے کے بعد بھی اس کی نظر محدود رہتی ہے۔ جس طرح بندہ اس دنیا میں دیوار کے پیچھے نہیں دیکھ سکتا اسی طرح اس دنیا میں بھی وہ کوتاہ نظر رہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ باطنی نظر کس طرح کھلے اور اس نظر پر جو جالا اور پھوڑا بن گیا ہے اس کا

آپریشن کس طرح ہو۔ اس کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وارث اولیاء اللہ نے اسباق بنائے ہیں۔ یہ سارے اسباق رسول اللہ ﷺ کی غار حرا میں تفکر کی پہلی سنت مراقبہ پر مبنی ہیں۔

الف۔ کمپیوٹر

کسی علم کو سیکھنے کے لئے اس کی الف ب پ سے واقفیت ہونا ضروری ہے۔ کوئی آدمی جب تک الف ب پ کا قاعدہ نہیں پڑھ لیتا اردو زبان پڑھنا لکھنا نہیں سیکھ سکتا۔ جب کہ اس کی مادری زبان بھی اردو ہے۔ مادری زبان کے علاوہ دوسری زبان بھی اس وقت سیکھنا ممکن ہے جب کوئی ابتدائی قاعدے سے واقف ہو مثلاً انگریزی پڑھنے لکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے لئے ''اے بی سی ڈی'' پڑھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی آدمی ابتدائی حروف جو آپس میں مل کر لفظ بنتے ہیں سے واقف نہ ہو اسے پڑھا لکھا آدمی نہیں کہا جا سکتا۔ چاہے وہ ذہنی طور پر کتنا ہی ذہین ہو جس طرح ظاہری علوم سیکھنے کے لئے قاعدہ پڑھنا اور لکھنا ضروری ہے اور جس طرح قاعدے سے واقفیت ضروری ہے۔ روحانی علوم سیکھنے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغمبروں اور پیغمبروں کے شاگردوں کا بنایا ہوا قاعدہ پڑھنا ضروری ہے۔ ظاہری علوم سیکھنے کے لئے الف ب پ پڑھنا ضروری ہے اور باطنی علوم سیکھنے کے لئے طرز فکر تبدیل کرنا ضروری ہے۔

روحانیت سیکھنے کے لئے بغدادی قاعدہ یا گرائمر کی کوئی کتاب انسانی تاریخ میں اب تک نہیں چھپی۔ روحانی علم منتقل ہوتا ہے اس کی آسان مثال بچے کے اندر ماں کی زبان کا منتقل ہونا ہے۔ کوئی ماں مادری زبان سکھانے کے لئے بچہ کو الف ب پ نہیں پڑھاتی۔ بچہ کے اندر طرز فکر وہی ہوتی ہے جو ماں باپ کی ہوتی ہے۔ بکری کا بچہ گھاس کھاتا ہے گوشت نہیں کھاتا۔ شیر کا بچہ گوشت کھاتا ہے گھاس نہیں کھاتا اور کبوتر کا بچہ نہ گھاس کھاتا ہے اور نہ گوشت کھاتا ہے، دانہ چگتا ہے۔ آدمی کا بچہ گوشت بھی کھاتا ہے، سبزی بھی کھاتا ہے، مٹی بھی کھاتا ہے، پتھر بھی کھاتا ہے، جڑیں بھی کھاتا ہے، لکڑی بھی کھاتا ہے۔ پتھر سے مراد نمک ہے، لکڑی سے مراد وہ جڑیں ہیں جو لکڑی کی طرح ہوتی ہیں مثلاً ہلدی، دار چینی وغیرہ۔ آدمی کا بچہ یہ اس لئے کھاتا ہے کہ اس کے ماں باپ یہ سب چیزیں کھاتے ہیں۔

آدمی کی طرح اگر شیر کی بھی یہی غذا ہوتی تو اس کے بچوں کی بھی یہی خوراک ہوتی۔ کھانا پینا شکار کرنا اور زندگی کے دوسرے عوامل شیر کے بچوں کو بغیر سیکھے ہوئے منتقل ہوتے ہیں یعنی ان سب چیزوں کو سیکھنے کے لئے قاعدہ پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ کوئی بھی مخلوق جو اس دنیا میں موجود ہے اپنی مادری زبان جانتی ہے اور ایک دوسرے کو مادری زبان میں اپنی کیفیات سے مطلع کرتی ہے۔ مرغی کو جب یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ اس کے بچوں کو چیل اٹھا کر لے جائے گی تو وہ ایک مخصوص آواز نکالتی ہے اور سارے بچے اس کے پروں میں سمٹ جاتے ہیں۔

علیٰ ہذاالقیاس ہر نوع اپنی اپنی زبان جانتی ہے اور یہ زبان اس کی نسل میں بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ گفتگو کا ایک اور طریقہ بھی ہے جس سے ہر شخص کسی نہ کسی وقت دوچار ہوتا ہے اور ہر شخص اس طریقے سے واقف ہے۔ یہ طریقہ اشاروں کی زبان ہے۔

آدمی کے اندر کوئی ایسا کمپیوٹر نصب ہے جو اس کی زندگی کے مختلف مراحل میں ہدایت دے رہا ہے۔ کبھی وہ ایسی ہدایت دیتا ہے جس سے آدمی غم زدہ ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسی ہدایات ملتی ہیں کہ وہ بغیر کسی سبب کے خوش ہو جاتا ہے۔ کبھی اسے پانی پینے کی اطلاع دی جاتی ہے، کبھی وہ کمپیوٹر اسے یہ اطلاع فراہم کرتا ہے کہ اعصاب میں حرکت کرنے کی صلاحیت نہیں رہی لہٰذا سو جاؤ۔ سوتے آدمی کو یہ اطلاع ملتی ہے کہ اب اگر مزید چارپائی پر لیٹے رہے اور شعوری حواس میں داخل نہیں ہوئے تو اعصاب منجمد ہو جائیں گے۔ لہٰذا فوراً اٹھ جاؤ اور حرکت شروع کر دو۔ جب تک کمپیوٹر کوئی اطلاع نہیں دیتا آدمی یا کوئی بھی ذی روح کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اس میں انسان، بھیڑ، بکری اور کسی جانور کی یا نباتات و جمادات کی کوئی قید نہیں ہے۔ سب کے اندر یہ اطلاع دینے والی مشین نصب ہے۔ اس مشین کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ وہی اطلاع فراہم کرتی ہے جو حالات اور وقت کے مطابق ہو۔

یہ کمپیوٹر آدمی کے اندر اس کی روح ہے۔ موجودات میں جتنی ذی روح یا غیر ذی روح سمجھی جانے والی مخلوقات ہیں سب میں ایک ہی طرح کا کمپیوٹر نصب ہے۔ انسان اور دوسری مخلوق میں اگر فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ انسان کے علاوہ دوسری کوئی مخلوق اس کمپیوٹر کے علم سے ناواقف ہے۔ صرف انسان کو اللہ کریم نے کمپیوٹر کا پورا علم سکھایا ہے۔

روح کالباس

انسان کی مجموعی زندگی پر غور کیاجائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ زندگی کی ساری طرزیں اور زندگی کو رواں دواں کرنے والے سارے تقاضے تمام احساسات و کیفیات اطلاعات پر قائم ہیں۔ کہیں ہمیں اطلاع ملتی ہے کہ سردی ہے۔ کہیں ہمیں اطلاع ملتی ہے کہ گرمی ہے، بھوک پیاس، تکلیف، خوشی، محبت، نفرت، رحم، ظلم اور زندگی میں کام آنے والے سارے کے سارے تقاضے اطلاعات کے اوپر قائم ہیں۔

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ زندگی اطلاعات کا مجموعہ ہے تو یہ تلاش کرنا ضروری ہو گیا کہ اطلاعات کا منبع کیا ہے؟

دوسری بات یہ غور طلب ہے کہ اطلاع کس جگہ آکر ٹھہرتی ہے اور ریسیونگ اسٹیشن جو اطلاعات قبول کرتا ہے، کہاں واقع ہے؟

تیسری بات یہ ہے کہ اطلاعات میں معانی پہنانے والی ایجنسی کون سی ہے؟

چوتھی بات یہ تحقیق طلب ہے کہ اطلاعات کو معانی پہنانے کے بعد مظاہرات کس مشین پر چھپ رہے ہیں؟

پانچویں بات یہ ہے کہ اس چھپائی میں جو مادہ کام کر رہا ہے وہ کیا ہے؟

اور چھٹی بات یہ ہے کہ اطلاعات مختلف مراحل سے گزر کر جب مظہر بن جاتی ہیں تو وہ کہاں نیست و نابود ہو جاتی ہیں؟

روحانی علوم کی پہلی کتاب میں یہ بات سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ گوشت پوست سے مرکب اور رگوں پٹھوں سے بنا ہوا پتلا اصل انسان نہیں ہے بلکہ گوشت پوست کا جسم اصل انسان کا لباس ہے۔ جس طرح گوشت پوست کی حفاظت کے لئے ہم اون کا، کھال کا روئی یا دوسری چیزوں کا لباس پہنتے ہیں۔

اسی طرح اصل انسان (ہماری روح) گوشت پوست کا لباس بناتا ہے۔ گوشت پوست کا جسم محض ایک لباس ہے اور جس ہستی کو اللہ کریم نے انسان کہا ہے۔ اسے عرف عام میں روح کا نام دیا گیا ہے۔ قاعدے اور قانون کے مطابق اگر کوئی بندہ روحانی علوم سیکھنا چاہتا ہے تو اس کے اندر یہ یقین راسخ ہونا ضروری ہے کہ گوشت پوست کا جسم مفروضہ اور فکشن ہے۔ جب یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ گوشت پوست کا جسم لباس ہے فکشن ہے، فنا ہونے والا ہے تو قدرتی طور پر مفروضہ حواس سے ذہن دور ہونے لگتا ہے اور جب مفروضہ زندگی سے ذہن پلٹتا ہے تو حقیقت کی طرف سفر شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ حقیقت اور مفروضہ دونوں چیزیں ایک مرکز پر جمع نہیں ہوتیں۔ مفروضہ حواس

اور مفروضہ چیزیں بدلتی رہتی ہیں، ٹوٹتی اور بکھرتی رہتی ہیں۔ فنا ہوتی رہتی ہیں لیکن حقیقت نہ بدلتی ہے، نہ ٹوٹتی ہے، نہ بکھرتی ہے اور نہ فنا ہوتی ہے۔ حقیقت جو قائم بالذات ہے، حقیقت جو اپنے مرکز پر مستقل طور پر رواں دواں ہے۔ اس انسان کی تلاش سے سامنے آتی ہے جس کو قرآن نے روح کہا ہے۔ مگر روح کے بھی مدارج ہیں۔ لاعلمی کی بنا پر روح کو بھی ایک ایسا ہی آدمی یا انسان سمجھا جاتا ہے جیسے گوشت پوست کا انسان۔ ہم دیکھتے ہیں کہ روح ایک ایسی حقیقت ہے جو جزلا تجزاء ہے جو اپنی ذات کے ساتھ وابستہ اور پیوست ہے اور قائم ہے۔ روح کی اپنی ایک صفت ہے۔ وہ یہ کہ روح ہر آن ہر لمحہ متحرک رہتی ہے اور قائم بالذات رہتے ہوئے طرح طرح کے روپ میں مظہر بنتی رہتی ہے۔ روح کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ مفروضہ اور فکشن حواس میں کبھی سامنے نہیں آتی البتہ مفروضہ اور فکشن حواس کو اپنے لئے لباس کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ لیکن چونکہ ہر لمحہ ہر آن متحرک رہنا اس کا ایک وصف ہے اس لئے وہ کبھی انسانی لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے، کبھی بکری کے لباس میں، کبھی جنات کے لباس میں اور کبھی فرشتوں کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

روحانی سائنسدانوں نے زمین پر تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار نوعوں کی نشاندہی کی ہے اور ہر نوع روح کا ایک جزو ہے۔ روح کی ایک تعریف یہ ہے کہ ایک طرف نوعی لباس اپنے لئے منتخب کرتی ہے اور دوسری طرف اس نوع کے افراد کی حیثیت میں مختلف لباس اختراع کرتی رہتی ہے۔ روح کی اس کارکردگی کو جاننے کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ روح کا نوعی لباس نیگیٹیو ہے اور نوعوں کے افراد اس نیگیٹیو کا Positive ہیں۔ یہ عجیب و غریب نظام ہے کہ روح نوع لباس اور نوع کے افراد کا لباس بناتی رہتی ہے اور یہ لباس سوت اور اون کے لباسوں کی طرح خستہ ہوتے رہتے ہیں۔ اس کو سمجھنا کوئی زیادہ مشکل بات نہیں ہے۔

اصل انسان یا روح جب لباس کی ابتدا کرتی ہے تو لباس ہمیں ایک خوبصورت نرم و نازک اور معصوم صورت بچہ میں نظر آتا ہے۔ اور پھر یہ لباس ہر آن اور ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ ہر آن ایک لباس اترتا ہے اور ایک لباس بنتا ہے۔ لباس کے اترنے اور بننے میں لباس میں تغیر واقع ہوتا ہے کہیں سیاہی بڑھ جاتی ہے، کہیں سیاہی گھٹ جاتی ہے، تصویر ایک ہے مشین بھی ایک ہے، چھپائی بھی ایک ہے لیکن ہر تصویر کے Impression میں کچھ نہ کچھ فرق پڑ جاتا ہے۔

بتدریج لباس تبدیل ہوتے ہوتے اس حال کو پہنچ جاتا ہے کہ اس میں مزید کوئی سکت باقی نہیں رہتی۔ اور یہ لباس ختم ہو جاتا ہے، سکت نہ رہنے کو ہم بڑھاپے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ قانون اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ بات پوری طرح سامنے آجائے اور ہم سمجھ لیں کہ روح ہر آن ہر لمحہ متحرک رہتی ہے۔ اور ہر آن اور ہر لمحہ کی حرکت دراصل روح کا ایک لباس ہے۔ یہی لباس ہمیں مظاہراتی طور پر شکل و صورت میں نظر آتا ہے۔

مٹی کا شیر

جس طرح روح کے لباس یعنی رگوں، پٹھوں، ہڈیوں اور گوشت سے مرکب آدمی کو انسان سمجھا جاتا ہے اور اس آدمی میں طرح طرح کے خدوخال ہمیں نظر آتے ہیں بالکل اسی طرح روح کے اندر بھی خدوخال موجود ہیں۔ جسم انسانی کے لئے جب لباس بنایا جاتا ہے تو یہ بات ہماری پیش نظر رہتی ہے کہ جسم کے زیادہ سے زیادہ حصے ڈھک جائیں جیسے قمیض شلوار۔ اس کے برعکس روح جب لباس بناتی ہے تو وہ لباس مکمل ہوتا ہے۔ مکمل ہونے سے مراد یہ ہے کہ روح کی شکل جس طرح کے خدوخال میں موجود ہے انہی مکمل خدوخال کے ساتھ لباس بنتا ہے۔

مثال:

مٹی کے شیر پر رنگ کر دیا جائے تو ہم اسے شیر ہی کہتے ہیں۔ ایک مٹی کا شیر رنگ کے بغیر ہے اور یہی مٹی کا شیر رنگین ہے۔ لیکن شیر کے اوپر رنگ کیا جاتا ہے تو یہ رنگ شیر کے اوپر غالب آ جاتا ہے مثلاً کان پر، آنکھوں پر، پیروں پر، پیٹ پر، پینٹ شدہ شیر کو بھی ہم شیر کہتے ہیں۔ روح جب لباس بناتی ہے تو اپنے خدوخال اور نقش و نگار کے مطابق پورا لباس تیار کرتی ہے۔ خدوخال میں جس طرح کی ناک ہو گی، جس طرح کے کان ہوں گے، جس طرح کے پیر ہوں گے، جس طرح کا سر ہو گا، اسی مناسبت سے جسمانی لباس تخلیق ہوتا رہتا ہے۔ اب ہم یوں کہیں گے کہ گوشت کا جسم روح کا اختراع کردہ ایک رنگ ہے یعنی روح جو مکمل خدوخال اور نقش و نگار کے ساتھ قائم ہے اس کے اوپر ایک رنگ آ گیا یعنی رنگ روح کا لباس ہے۔ یہی رنگ روح کے اوپر مختلف پرت ہیں۔ یہاں ایک بات بتا دینا ضروری ہے کہ جس طرح جسم انسانی پرت در پرت موجود ہے اس طرح روح بھی بے شمار پرتوں کا مجموعہ ہے۔ روح کا ہر پرت مجسم نقش و نگار کے ساتھ متحرک ہے۔ ایک لمحے کا کھربواں حصہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں حرکت ساکت ہو جاتی ہے۔ اگر لمحے کے کھربویں حصے میں بھی روح ساکت ہو جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

کائنات میں جتنی اشیاء موجود ہیں وہ زمین کے اوپر ہوں، زمین کے اندر ہوں، آسمانی مخلوق ہو، سات آسمان ہوں، عرش و کرسی ہو، ہر شئے میں روح موجود ہے۔ اور ہر چیز ہمیں ظاہر آنکھوں سے یا صفاتی آنکھوں سے نظر آتی ہے وہ سب روح کا لباس ہے۔ جب ہم کبوتر کو دیکھتے ہیں تو کبوتر کی پوزیشن بھی وہی ہے جو آدمی کی ہے۔ جس طرح روح آدمی کے خدوخال کے مطابق لباس بنا کر اپنا مظاہرہ کرتی ہے، جس طرح روح نکلنے کے بعد آدمی کی کوئی حیثیت برقرار نہیں رہتی، اسی طرح کبوتر کے اندر سے روح نکلنے کے بعد کبوتر کی کوئی حیثیت باقی

نہیں رہتی۔ جسم انسانی سے روح اگر اپنا رشتہ منقطع کرلے تو یہ جسم منتشر ہو جاتا ہے اور منتشر ہو کر مٹی کے ذرات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جس جسم کو ہم کبوتر، بھیڑ یا بندر کے نام سے جانتے ہیں وہ انسانی جسم سے مختلف نہیں ہوتا۔ انسان کی طرح ہر جسم منتشر ہو کر مٹی کے ذرات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

قانون:

روح ایک ایسا مادہ ہے جس کے اندر پورے پورے خدوخال موجود ہیں۔ خدوخال کی یہ موجودگی دراصل روح کی صلاحیت کی نشان دہی ہے۔ روح ایک مشین ہے یا ایک ایسا کمپیوٹر ہے جس کی بے شمار ڈائیاں ہیں۔ مختلف ڈائیوں میں جب مسالہ پڑتا ہے تو ڈائی کے مطابق نئے نئے لباس میں نئی نئی صورتیں مظہر بن کر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ کبوتر کی شکل وصورت کی ڈائی میں پلاسٹک کا مسالہ ڈالا جائے تو کبوتر بنے گا۔ پھول کی ڈائی میں مسالہ ڈالا جائے تو پھول بنے گا، علیٰ ہذالقیاس ڈائیاں مختلف ہیں مسالہ ایک ہے۔ لیکن اس مسالے کی بنیاد پر ہر شکل مختلف بن رہی ہے۔ ڈائی کے اوپر اگر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ کبوتر کی ڈائی میں اور بلی کی ڈائی میں ایک نمایاں فرق ہے۔ اس نمایاں فرق کو قرآن مقداروں کا نام دیتا ہے یعنی ہر ڈائی مختلف اور معین مقداروں سے بنی ہوئی ہے اور یہ معین مقداریں باوجود ایک ہونے کے الگ الگ ہیں۔ اس کے لئے شکل وصورت میں اختلاف واقع ہوتا رہتا ہے۔ ڈائی جس چیز یا مسالے سے بنی ہے وہ بھی ایک ہے اور ڈائی کے اندر جو مسالہ ڈالا گیا ہے وہ بھی ایک ہے لیکن ڈائی بذات خود مختلف ہے۔ یہ اختلاف ہی مختلف شکل وصورت کا سبب بنتا ہے۔ ایک طرح کی مقداروں سے ایک نوع تخلیق ہو جاتی ہے۔ اس نوع کے اندر معین مقداروں میں جب ردوبدل ہوتا ہے تو افراد وجود میں آتے ہیں۔ نوع کی معین مقداریں جب آدم کے رنگ میں جلوہ افروز ہوتی ہیں تو آدم کی صورت سامنے آجاتی ہے۔ آدم جن مقداروں کا نام ہے جب ان مقداروں میں ہیجان پیدا ہوا اور ہیجان کی وجہ سے مقداروں میں ٹوٹ پھوٹ واقع ہوئی تو مقداروں کا توازن بدل گیا۔ مقداروں کا توازن بدلنا یہ معنی رکھتا ہے کہ نئی مقداریں وجود میں آگئیں جیسے ہی مقداروں میں ہیجان پیدا ہوا اور اس ہیجان سے مقداروں میں ردوبدل ہوا نتیجے میں حوا کا وجود بابا آدم کے سامنے آگیا۔

اب مقداروں کے دورخ متعین ہو گئے۔ باوجود اس کے کہ مقداروں میں ردوبدل واقع ہوا جب اس ردوبدل کے نتیجے میں کوئی صورت وجود میں آئی تو اس صورت کے اندر بھی مقداریں معین ہو گئیں۔ مقداریں معین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ڈائی کے اندر مخصوص طاقت مخصوص وزن مخصوص رنگ کی مقداریں جمع ہو جائیں تو ایک خوبصورت تصویر بنتی ہے جس کا نام آدم ہے اور اگر اس ڈائی میں ایسی مقداریں جمع ہو جائیں جس کا رنگ قدرے مختلف ہو، وزن دوگنا پھر وزن کم یا قدرے زیادہ ہو اس صورت کا نام عورت ہے۔ ڈائی کے اندر جو مسالہ ڈالا جاتا ہے وہ بھی ایک ہے لیکن مقداروں میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے اور مقداروں کے ردوبدل سے نئی نئی شکلیں وجود میں آتی رہتی ہیں۔ اللہ کریم نے ارشاد فرمایا ہے کہ پاک اور بلند مرتبہ ہے وہ ذات جس نے تخلیق کیا معین مقداروں سے اور پھر ان مقداروں سے مرکب مخلوق کو زینت بخشی اور اس مخلوق کو ایک رنگ دیا۔ زمین پر رنگ رنگ کی مخلوق کے اندر ایک معین چیز ڈالی جو میٹر ہے اور جو چیز الگ الگ کرتی ہے وہ مقداریں ہیں اور ان مقداروں کو ہم رنگ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ رنگوں میں ردوبدل شکل وصورت کا باعث بنتا ہے۔

جس طرح معین مقداروں سے صورت بنتی ہے اور مختلف شکلیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔اسی طرح معین مقداروں سے ہمارے اندر حواس بنتے ہیں جب تک حواس معین مقداروں پر قائم ہیں۔صحت مند ہیں اور حواس کے اندر مقداریں کم یا زیادہ ہوں تو حواس غیر صحت مند ہو جاتے ہیں۔

بارہ کھرب کل پرزے

مختصر طور پر زندگی کا تذکرہ کیا جائے تو یہ کہنا مناسب ہے کہ زندگی جذبات سے عبارت ہے اور زندگی کے بے شمار جذبات حواس کے دوش پر سفر کر رہے ہیں۔ان جذبات کو کنٹرول کرنا حواس کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

مثال:

ایک آدمی کو پیاس لگی۔پیاس ایک تقاضا ہے، پیاس کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے حواس ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔حواس ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ پانی گرم ہے۔یہ پانی سرد ہے یہ پانی کڑوا ہے یا یہ پانی میٹھا ہے۔پیاس کا تقاضہ پانی پینے سے پورا ہوتا ہے۔پانی کی پہچان بھی حواس کے ذریعے ممکن ہے۔ایک تقاضہ پیاس ہے، ایک تقاضہ بھوک ہے۔کسی کو چاہنا ایک الگ تقاضہ ہے اور آدمی کے اندر یہ تقاضہ پیدا ہونا کہ کوئی مجھے بھی چاہے الگ تقاضہ ہے۔ان تقاضوں کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو اس کا نام زندگی ہے اور جب ان تقاضوں کو الگ الگ کر کے دیکھا اور سمجھا جائے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہر تقاضہ اس لئے الگ الگ ہے کہ تقاضوں کے اندر مقداریں الگ الگ کام کر رہی ہیں۔پیاس کے تقاضے میں جو مقداریں کام کر رہی ہیں وہ بھوک کے تقاضے میں موجود نہیں ہیں اس لئے صرف پانی پی کر بھوک کا تقاضہ رفع نہیں ہوتا۔ بھوک کے اندر جو مقداریں کام کر رہی ہیں اس کی اپنی الگ ایک حیثیت ہے۔یہی وجہ ہے کہ صرف کچھ کھا کر پیاس کا تقاضہ پورا نہیں ہوتا۔

حواس الگ الگ تقاضوں کو جانتے ہیں، سمجھتے ہیں انسانی زندگی میں ایک تقاضہ محبت ہے۔محبت ایک ایسا مجموعی تقاضہ ہے جس کے بغیر زندگی ادھوری اور نامکمل رہتی ہے۔حواس محبت کے اس تقاضے کو الگ الگ حیثیت دیتے ہیں مثلاً یہ کہ حواس ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ خاتون ہماری بیوی ہے اور یہ لڑکی بیٹی ہے اور یہ خاتون ہماری ماں ہے۔جب ہم محبت کا نام لیتے ہیں تو محبت کا مجموعی مفہوم ہمارے ذہن میں کسی کا چاہنا آتا ہے لیکن جب حواس کے ذریعے محبت کو سمجھتے ہیں تو محبت کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ایک عورت ہر حال میں عورت ہے لیکن حواس اس عورت کو الگ الگ تقسیم کر دیتے ہیں۔حواس ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ عورت ہماری بہن ہے، یہ عورت ہماری بیٹی ہے، یہ عورت ہماری ماں ہے اور یہ عورت ہماری بیوی ہے۔بحیثیت عورت و مرد سب میں قدریں مشترک ہیں لیکن حواس ہمیں بتاتے ہیں کہ مشترک قدروں میں بھی ایک ضابطہ اور قانون ہے۔

بتانا یہ مقصود ہے کہ انسانی زندگی جس بنیاد پر قائم ہے اس کے دو پیر یا دو ستون ہیں۔ایک پیر یا ستون جذبہ ہے اور ایک پیر یا ستون حواس ہے۔جب تک آدمی جذبات کے دائرے کار میں رہتا ہے۔اس وقت تک اس کی حیثیت دوسرے حیوانات سے الگ نہیں ہے اور

جب ان جذبات کو وہ انسانی حواس کے ذریعے سمجھتا ہے اور جذبات کی تکمیل میں حواس کا سہارا لیتا ہے تو وہ حیوانات سے الگ ہو جاتا ہے۔ جذبات اور حواس کا اشتراک انسانوں کی طرح حیوانوں میں بھی موجود ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ایک بکری یا ایک گائے انسانوں کی طرح حواس میں معنی نہیں پہنا سکتی۔ اس کا علم زندگی کو قائم رکھنے کی ضروریات پوری کرنے تک محدود ہے۔ وہ صرف اتنا جانتی ہے کہ پانی پینے سے پیاس بجھتی ہے، پتے کھانے سے بھوک رفع ہوتی ہے اس بات سے اسے کوئی غرض نہیں ہے کہ پانی کس کا ہے۔ اس کے اندر زندگی قائم رکھنے کے لئے ایک تقاضہ ہوتا ہے اور وہ تقاضہ پورا کر لیتی ہے اس کے برعکس انسان کے اندر زندگی کو قائم رکھنے کے لئے جب تقاضہ ابھرتا ہے تو وہ حواس کے ذریعے یہ بات سمجھتا ہے کہ یہ تقاضا کس طرح پورا کیا جاتا ہے۔

چونکہ انسان کو اللہ کریم نے حواس کا مخصوص علم عطا کیا ہے اس لئے انسان دوسری مخلوق کے مقابلے میں ممتاز ہو گیا ہے اور یہ ممتاز ہونا ہی مکلف ہونا ہے۔

یہ بات واضح طور پر سامنے آگئی ہے کہ زندگی قائم رکھنے کے لئے اللہ کریم کی تمام مخلوق میں تقاضے یکساں ہیں۔ آدمی کو بھی بھوک لگتی ہے بکری اور بلی کو بھی بھوک لگتی ہے۔ پیاس آدمی کو بھی لگتی ہے اور پیاس دوسرے حیوانات کو بھی لگتی ہے۔ دونوں بھوک اور پیاس کے تقاضے کو پورا کرتے ہیں۔ لیکن انسان تقاضوں اور حواس کی حیثیت سے واقف ہے۔ یہ وقوف ہی انسان کو شرف کے درجے پر فائز کرتا ہے۔ حواس کے قانون سے واقف ہونا روحانی سفر کی ابتدا ہے۔

انسان کے اندر بارہ کھرب کل پرزوں سے مشین کام کر رہی ہے۔ کچھ کل پرزے ایسے ہیں جو حواس بناتے ہیں کچھ کل پرزے ایسے ہیں جو جذبات کی تخلیق کرتے ہیں۔ انسان کو اللہ کریم نے یہ علم عطا کیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو جان لیتا ہے کہ اس کے اندر نصب شدہ مشین میں یہ کل پرزے کس طرح فٹ ہیں اور ان کے ذریعہ جذبات اور حواس کس طرح بنتے ہیں۔ جذبات اور حواس کے اعتبار سے انسان اور تمام حیوانات ایک صف میں کھڑے ہیں لیکن بکری کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ حواس بنانے کی مشین یا حواس بنانے کے کل پرزوں کو سمجھ سکے۔ اگر کوئی انسان بکری کی طرح اپنے اندر نصب شدہ اس کائناتی نظام کو نہیں سمجھتا تو اس کی حیثیت بلی اور کتے سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ بھوک کتے کو بھی لگتی ہے، پیٹ کتا بھی بھرتا ہے۔ بھوک آدمی کو بھی لگتی ہے۔

پیٹ آدمی بھی بھرتا ہے، پیاس چوہے کو بھی لگتی ہے، پیاس آدمی کو بھی لگتی ہے، پانی آدمی بھی پیتا ہے۔ جبلی طور پر ایک آدمی بھی اپنی اولاد کی پرورش کرتا ہے، اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے، اپنی اولاد کی تربیت کرتا ہے بالکل اسی طرح بلی بھی اپنی اولاد سے محبت کرتی ہے، اولاد کی پرورش کرتی ہے۔ اپنی اولاد کو دودھ پلاتی ہے اور زندگی گزارنے کے لئے تمام ضروری باتوں سے آگاہ کر کے بچوں کی تربیت کرتی ہے۔ روحانی نقطہ نظر سے اگر کوئی آدمی سب کچھ وہی کام کرتا ہے جو ایک بلی کرتی ہے تو اس کی حیثیت بلی کے برابر ہے اور اسے بلی سے افضل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کوئی انسان بلی کتے چوہے سے اس لئے افضل ہے کہ اللہ کریم نے اسے اپنے اندر نصب شدہ مشین یا کمپیوٹر کا علم سکھا دیا ہے۔

اللہ اور آدم

جذبات کے اندر رہتے ہوئے تقاضے پورے کرنا جبلت ہے۔ اور جذبات اور حواس کو الگ الگ سمجھنا اور جذبات اور حواس کے مفہوم سے باخبر ہونا خود آگاہی ہے۔ خود آگاہی فطرت ہے۔ جبلت بدلتی رہتی ہے۔ فطرت میں تغیر اور تبدل واقع نہیں ہوتا۔ اللہ کریم نے جس چیز کو جس فطرت پر پیدا کر دیا اس میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ انسان کو دوسرے حیوانات اور دوسری مخلوقات سے ممتاز کر کے اللہ نے علم الاسماء کی صفات کا علم عطا فرمایا۔ یعنی اللہ نے اپنی یکجائی صفات آدم کو سکھادیں۔ یکجائی صفات سے مراد یہ ہے کہ اللہ کریم نے جس حد تک اور جس قدر مناسب سمجھا آدم کو اپنی تخلیقی صفات کا علم عطا کر دیا۔ اللہ کے اسماء اللہ کی صفات ہیں چونکہ اللہ خالق کائنات ہے اس لئے اللہ کی ہر صفت اللہ کریم سے ہم رشتہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے اپنی ان صفات کے وہ علوم آدم کو سکھا دیئے جن صفات کے اوپر کائنات کی تخلیق وجود میں آئی۔ یہ اس لئے ہوا کہ خالق چاہتا ہے کہ مجھے پہچانا جائے۔ پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ آدم خالق کی صفات کا علم رکھتا ہو۔ صفات کا یہ علم اللہ نے دوسری مخلوقات فرشتوں کو بھی عطا کیا لیکن تخلیقی صفات کے جو علوم اللہ نے آدم کو عطا کئے وہ فرشتوں کو نہیں بتائے۔

مفہوم یہ نکلا کہ آدم کی فضیلت اس بنیاد پر ہے کہ وہ اللہ کی تخلیقی صفات سے واقف ہے چونکہ اللہ نے اس کو اپنی صفات کا علم عطا کر دیا ہے اس لئے یہ ان صفات کو جاننے کے بعد اللہ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کی دوسری مخلوق اللہ کو نہیں جانتی۔ اللہ کی دوسری مخلوق بھی اس بات سے واقف ہے کہ ہمارا پیدا کرنے والا اللہ ہے اور وہی ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے اور اس نے ہی ہمارے لئے وسائل فراہم کئے ہیں۔

جاننے کی دو طرزیں ہیں۔ ایک طرز یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو جانتا ہے کہ فلاں آدمی دنیا میں موجود ہے۔ کسی حد تک اس کی صفات سے واقف ہے۔

دوسرا آدمی اس آدمی سے متعارف بھی ہے اور اس کو اس کی قربت بھی حاصل ہے۔ قربت کی وجہ سے وہ اس کو دیکھتا بھی ہے۔

اس کی بات بھی سنتا ہے۔ اور اس کے سامنے اپنی معروضات بھی پیش کرتا ہے۔

تمام مخلوق پہلی طرز سے واقف ہے۔ مگر مخلوق آدم چونکہ اللہ کی صفات کا علم رکھتی ہے اس لئے وہ اللہ سے قربت حاصل کر کے اللہ کا عرفان حاصل کر لیتی ہے۔ عرفان سے مراد محض لفظی عرفان نہیں ہے۔ عرفان سے مراد یہ ہے کہ اسے اس بات کا یقین حاصل ہو جاتا ہے

کہ میں مخلوق ہوں اور مجھے پیدا کرنے والا اللہ میرا خالق ہے اور اس یقین کے بعد وہ اللہ کو دیکھتا ہے۔ اللہ کی آواز سنتا ہے۔ اللہ کو محسوس کرتا ہے۔ اللہ سے گفتگو کرتا ہے۔ اللہ جب اس سے کچھ کہتا ہے تو اس کی گفتگو سن کر سرشاری کی کیفیت میں اس کی تکمیل کرتا ہے۔ وہ یہ بات جان لیتا ہے کہ میرا وجود اللہ کے رحم و کرم اور اللہ کی محبت پر قائم ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات پوری طرح قائم ہو جاتی ہے کہ میری زندگی میں ہر حرکت اور میری زندگی کا ہر عمل اس بنیاد پر قائم ہے کہ مجھے اللہ نے سنبھالا ہوا ہے۔ وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ مجھے اللہ نے کس مشیئت کے تحت پیدا کیا ہے۔ میری پیدائش کی غرض و غایت کیا ہے۔ پیدا ہونے سے پہلے میں کس عالم میں موجود تھا اور مرنے کے بعد میں کس عالم میں منتقل ہو جاؤں گا۔ وہ اس بات سے باخبر ہو جاتا ہے کہ فرشتے اس کے مسجود ہیں یعنی اس کے سامنے وہ سارا نقشہ آجاتا ہے جس کا تذکرہ قرآن نے انی جاعل فی الارض خلیفہ میں کیا ہے۔

یہ بات بہت زیادہ غور طلب ہے کہ آدم کی اولاد آدم ہے اور آدم کی اولاد بحیثیت آدم کے اس بات کا مشاہدہ کر سکتی ہے جن مشاہدات سے آدم گزرا ہے۔ اگر آدم زاد اس بات کا مشاہدہ نہ کرے جس حالت کا مشاہدہ آدم نے کیا ہے یعنی خود کو فرشتوں کا مسجود دیکھنا۔ اللہ اور فرشتوں کے درمیان مکالمہ ہونا۔ اللہ کریم کا یہ ارشاد فرمانا کہ ہم نے آدم کو اپنی تمام صفات کا علم سکھا دیا ہے اور فرشتوں کا یہ کہنا کہ ہم صرف اس حد تک واقف ہیں جس حد تک آپ نے ہمیں عطا فرما دیا ہے۔ یہ تمام فلم اگر آدم زاد بندے کے سامنے نہ آئے تو وہ ہرگز آدم کی اولاد کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ اس کی حیثیت اس آدم کی ہرگز نہیں ہے جس آدم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ میرا نائب اور خلیفہ ہے۔ اس کے اختیارات استعمال کرنے پر قدرت نہیں رکھتا تو وہ ہرگز نائب نہیں ہے۔

اس تمام گفتگو کا اجمال یہ ہوا کہ آدم زاد اگر ازل میں اس واقع سے واقف نہیں ہے اور ان واقعات کو اس زندگی میں نہیں دیکھتا جن کی بنیاد پر آدم کو نائب اور خلیفہ بنایا گیا ہے تو وہ آدم کی صف میں شمار نہیں ہوتا اور اگر کھینچ تان کر محض شکل و صورت کی بنیاد پر اس کو آدم زاد کہہ بھی دیا جائے تو اس کو ناخلف اولاد سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے کہ وہ اپنے باپ کے ورثے سے محروم ہے۔ باپ کے ورثے سے محروم اولاد ناخلف ہوتی ہے، بدنصیب ہوتی ہے، مفلوک الحال ہوتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر کوئی بندہ اللہ کے اسماء کا علم نہیں جانتا تو وہ اللہ کا نائب نہیں ہے۔ آدم زاد کو دوسری مخلوقات پر جو شرف حاصل ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آدم زاد اللہ کے اسماء کا علم جانتا ہے اور اس علم کی بنیاد پر وہ اللہ کا نائب ہے۔ چونکہ آدم اللہ کا نائب ہے اس لئے وہ اللہ کے اختیارات استعمال کر سکتا ہے۔ اللہ کے اختیارات بحیثیت خالق کائنات کے وہ اختیارات ہیں جنہیں تخلیقی اختیارات کہا جاتا ہے۔

اللہ نے اپنے لئے ارشاد فرمایا ہے کہ میں احسن الخالقین ہوں یعنی میں تخلیق کرنے والا ہوں۔ میں بہترین خالق ہوں۔ آیت مبارکہ سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق ہے یعنی اللہ نے بندوں کو بھی تخلیقی صلاحیتیں منتقل کی ہیں۔ یہ تمام صلاحیتیں وہ اسماء ہیں جن کے بارے میں خالق کائنات نے ارشاد فرمایا:

و علم آدم الاسماء کلھا

اور ہم نے آدم کو تمام اسماء کا علم سکھادیا۔

علم الاسماء سے مراد کائنات میں وہ تخلیقی فارمولے ہیں جن تخلیقی فارمولوں سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے۔

قالو بلیٰ

مذہبی دانشور کہتے ہیں کہ آدمی اللہ کی آواز نہیں سن سکتا۔ ایک بڑا گروہ ایسا بھی ہے جو اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اللہ کو دیکھنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس دنیائے ناپیدا کنار میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو روحانی قدروں کو مفروضہ (Fiction) اور قوت متخیلہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں دنیا میں بڑی آبادی اللہ سے ہم کلام نہیں ہو سکی۔

فقرا کا یہ کہنا ہے کہ بندہ اللہ کا عرفان حاصل کر کے اللہ سے ہمکلام ہو سکتا ہے یا کوئی بندہ اگر اللہ کو دیکھنا چاہے تو دیکھ سکتا ہے۔ اللہ سے بندے کی قربت اور دوری یہ دونوں باتیں قرآن پاک میں بیان کی گئی ہیں۔ اللہ نے تخلیق کائنات کے بعد جب کائنات کو مخاطب کر کے فرمایا (الست بربکم) میں تمہارا رب ہوں۔ مخلوق نے جواباً عرض کیا۔ جی ہاں ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ آپ ہمارے رب ہیں۔ کوتاہ عقل والا بندہ بھی اس بات کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ اللہ نے جب مخاطب کیا تو مخلوق کے کان میں آواز پڑی جیسے ہی کان میں آواز پڑی مخلوق کی نظر اٹھی اور مخلوق نے اللہ کو دیکھا۔ دیکھنے کے بعد مخلوق فوراً پکار اٹھی کہ جی ہاں ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ آپ ہمارے رب ہیں۔

قرآن مجید نے دو باتوں کی وضاحت کی ہے۔ اللہ کی آواز سننا اور آواز سن کر اللہ کو دیکھنا اور دیکھنے کے بعد اقرار کرنا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مخلوق نے اللہ کی دی ہوئی سماعت کو استعمال کیا اور جب مخلوق کے اندر اللہ کی دی ہوئی سماعت متحرک ہوئی تو مخلوق کو بصارت مل گئی۔ وہ دیکھنے کے وصف سے واقف ہو گئی۔

مخلوق کے کان میں پہلی آواز اللہ کی پڑی اور مخلوق کی نظر نے سب سے پہلے اللہ کو دیکھا۔ سماعت کی بنیاد یہ بنی کہ سماعت نے پہلی جو آواز سنی وہ اللہ کی آواز تھی۔ دیکھنے کی بنیاد یہ بنی کہ نظر نے جس چیز کو پہلی بار دیکھا وہ اللہ کی ہستی ہے۔

کائنات میں جتنی بھی مخلوق ہے اجتماعی طور پر سب نے اللہ کی آواز سن کر اللہ کو دیکھا اور اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیا۔ اجتماعی شعور حاصل ہونے کے بعد دوسری چیز جو مخلوق کو حاصل ہوئی وہ یہ ہے کہ مخلوق کو اپنا ادراک حاصل ہو گیا یعنی مخلوق نے اس بات کو سمجھ لیا کہ اللہ نے مجھے تخلیق کیا ہے۔ مجھے تخلیق کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ مخلوق کو اپنا ادراک حاصل ہو گیا۔ اس کو ہم اس طرح کہیں گے کہ اللہ نے اپنی مشیئت منشاء اور مرضی سے ایک کائنات بنائی۔ اس کائنات کے بندوں کو سننے، بولنے، چکھنے، محسوس کرنے اور دیکھنے کی صلاحیت منتقل کی اور یہ ساری صلاحیتیں خود اللہ کی اپنی صلاحیتیں ہیں۔ اس لئے کہ جب اللہ نے الست بربکم فرمایا تو سماعت کے لئے پہلی آواز اللہ تعالیٰ کی آواز

قرار پائی۔ مخلوق نے جب نظر اٹھا کر دیکھا تو نظر کا ٹارگٹ وہ ہستی بنی جو خالق ہے۔ مخلوق نے یہ محسوس کیا کہ میرا بنانے والا اللہ میرے سامنے موجود ہے جیسے ہی مخلوق کے ذہن میں یہ بات آئی کہ میرا بنانے والا کوئی ہے تو ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن نشین ہو گئی کہ میں مخلوق ہوں۔

یہ تذکرہ اس عالم کا ہے جس کو پیراسائیکالوجی میں ''عالم ارواح'' کہا جاتا ہے۔ ادراک، سماعت اور بصارت کی حیثیت اجتماعی ہے یعنی تمام مخلوق یکجا طور پر موجود ہے۔ مخلوق میں کبوتر، چڑیا، بیل گائے، بھینس، جنات، فرشتے، آدم وغیرہ ہیں۔ اس تخاطب اور اقرار کے بعد ہر ایک کو اپنا اپنا ادراک حاصل ہوا تو مخلوق نے خود کو پہچانا۔ پہچاننے سے مراد یہ ہے کہ الگ الگ نوعیں بن گئیں۔ اب نوعی پروگرام مرتب ہو کر لوح محفوظ پر آیا۔ لوح محفوظ سے یہ پروگرام تقسیم ہو کر ہر نوع کا انفرادی پروگرام بن گیا۔ جہاں نوعیں انفرادی حیثیت میں متعارف ہوئیں اس کا نام پیراسائیکالوجی میں ''حضیرہ'' ہے۔ حضیرہ ایک جنریٹر (Generator) ہے جس کے اوپر فلم کا ایک ایسا فیتہ چلتا ہے جس میں نوعی پروگرام اور انفرادی پروگرام ایک ساتھ ڈسپلے ہوتے ہیں۔ اس فلم کا مظاہرہ زمین کے اوپر ہوتا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی فلم جس اسکرین پر ڈسپلے ہو رہی ہے اس کا نام زمین ہے۔ مخلوق کی بنائی ہوئی فلم ایک محدود جگہ کپڑے یا اسکرین پر ڈسپلے ہوتی ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی فلم زمین پر ڈسپلے ہوتی ہے یعنی اللہ نے زمین کو فلم ڈسپلے کرنے کے لئے اسکرین بنا دیا ہے۔

تخلیق کی بنیادی حیثیت پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ آدم زاد اللہ کی سماعت سے سنتا ہے۔ اللہ کی بصارت سے دیکھتا ہے اور اللہ کی فہم سے سوچتا ہے پھر یہ کیسے کہا جاتا ہے کہ بندہ اللہ کو دیکھ نہیں سکتا یا کوئی بندہ اللہ سے ہم کلام نہیں ہو سکتا؟ اللہ کو دیکھنے کی طرف متوجہ نہ ہونا اور اللہ کی آواز سننے کے لئے جدوجہد اور کوشش نہ کرنا بدبختی اور بدنصیبی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جو بندے اللہ کی قربت کے لئے اللہ کی آواز سننے کے لئے اللہ کو دیکھنے کے لئے جدوجہد اور کوشش کرتے ہیں ان کی کوشش اس لئے کامیاب ہوتی ہے کہ وہ جس نظر سے دیکھ رہا ہے فی الواقع وہ نظر اللہ کی نظر ہے جس سماعت سے وہ سن رہا ہے فی الواقع وہ اللہ کی سماعت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہم اس بصارت کو جس بصارت کا ٹارگٹ اللہ ہے بہت زیادہ محدود طرزوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ہم نے اس بات کو اپنے لئے یقین بنا لیا ہے کہ ہم دیوار کے پیچھے نہیں دیکھ سکتے۔ جب کہ اللہ کے ارشاد کے مطابق اس نظر نے اللہ کو دیکھا ہے اور بندہ نے اللہ کو دیکھ کر اس کی ربوبیت کا اقرار کیا ہے۔

اللہ کیا چاہتا ہے؟

اللہ کریم نے کائنات کو اس لئے تخلیق کیا ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ کائنات میں بااختیار اور مکلف مخلوق اپنا ارادہ اور اختیار استعمال کر کے اس راستے پر قدم بڑھائے جو راستہ قدم بقدم چلا کر اللہ تک لے جاتا ہے۔ خالق اپنی مخلوق سے یہ چاہتا ہے کہ مخلوق خالق کو پہچان کر، دیکھ کر، سمجھ کر اس کی ربوبیت کا اقرار کرے اور اس سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرے۔ مخلوق کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ ہمارا پیدا کرنے والا ہی ہماری حفاظت کرتا ہے، ہمارا نگہبان ہے اور ہمیں زندہ رکھنے کے لئے وہ تمام وسائل فراہم کرتا ہے جن وسائل کے اوپر زندگی کا دارومدار ہے۔ اتنے بڑے مربوط اور منظم انتظام کے ساتھ نگہداشت اور نگہبانی کا منشاء صرف یہ ہے کہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ بندے کے ذہن پر یہ بات منکشف ہو جائے کہ اللہ نے اپنی مخلوق کو محبت کے ساتھ پیدا کیا۔ جس طرح اللہ نے محبت کے ساتھ مخلوق کو تخلیق کیا اسی طرح مخلوق بھی محبت کے ساتھ اللہ کی قربت حاصل کرے۔

اللہ کی محبت کا مظاہرہ ہمیں ماں کی محبت میں ملتا ہے۔ ماں تخلیق کا ایک ذریعہ ہے۔ ماں کے پیٹ میں بچے کی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔ اس نشوونما میں براہ راست ماں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا لیکن ماں چونکہ تخلیق کا ذریعہ بنتی ہے اس لئے ماں کے اندر اولاد کی جو محبت ہوتی ہے وہ کسی دوسری ہستی میں نہیں ہوتی۔ کوئی باشعور بچہ اگر ماں کے ہونے سے انکار کر دے تو ماں کے اوپر جو گزرے گی اس کا اندازہ ایک ماں ہی کر سکتی ہے۔ تخلیق اور محبت کا دوسرا پر تو باپ ہے۔ باپ اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت کرتا ہے۔ اولاد کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے اور معاشرے میں اس کو مقام حاصل ہو جائے۔ یہ سب کچھ ہونے کے بعد اولاد اگر باپ سے منحرف ہو جائے، باپ کو پہچاننے سے انکار کر دے، باپ کی قربت کو اپنے لئے ایک غیر ضروری بات سمجھے، باپ کے اوپر جو کچھ گزرے گی اس کا تصور صرف وہ بندہ کر سکتا ہے جس کے اندر باپ کی شفقت کے جذبات بیدار ہوں۔

اصل خالق اللہ ہے۔ ماں باپ اللہ کی تخلیق کو منظر عام پر لانے کا ایک ذریعہ ہیں۔ ماں باپ یہ بات بھی جانتے ہیں کہ اولاد کا ہونا نہ ہونا، اولاد کا زندہ رہنا، اولاد کا ذی شعور ہونا، اولاد کا کند ذہن ہونا یا دانشور ہونا سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جو لوگ اللہ کے اوپر یقین نہیں رکھتے اور اللہ کی ہستی کا انکار کرتے ہیں بہر کیف انہیں بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سنبھالنے والی کوئی ہستی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض نے اللہ کی بجائے اس ہستی کا نام نیچر رکھ لیا ہے۔

ماں باپ اس بات سے باخبر ہیں کہ اولاد کی پیدائش کے لئے وہ ایک ذریعہ ہیں۔ قدرت اگر چاہے تو وہ ذریعہ بن سکتے ہیں اور قدرت اگر نہ چاہے تو وہ اولاد کی نعمت سے محروم رہتے ہیں۔ اس کے باوجود اولاد سے بجا طور پر توقع رکھتے ہیں کہ اولاد ماں باپ کو پہچانے، اولاد ان کے مرتبے اور ان کے درجے کے مطابق ان کا احترام کرے۔

دراصل یہ وصف وہ وصف ہے جو خالق کا ذاتی وصف ہے یعنی اللہ یہ چاہتا ہے کہ جس محبت، تعلق خاطر اور پیار کے ساتھ اللہ نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے یہ کائنات بھی اسی پیار اور محبت کے ساتھ اللہ کو پہچانے۔ جس طرح ایک بچہ ماں باپ کے حکم کی خلاف ورزی کرکے اور ان اقدار کو پامال کر کے جو معاشرے میں قائم ہیں، ناخلف اور ناسعادت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کو پہچاننے سے انکار کر دے تو وہ بھی ناخلف، باغی اور ظالم ہے اور جب کوئی بندہ خود اپنے لئے بدبختی کو قبول کر لیتا ہے اور اپنے اوپر جہالت اور ظلم کو مسلط کر لیتا ہے تو ''بدبختی'' اس کی زندگی بن جاتی ہے۔ زندگی میں سے سکون ختم ہو جاتا ہے اور اطمینان قلب سے محروم ہو جاتا ہے۔ خوف اس کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے اور جب کوئی بندہ اس دردناک عذاب اور مصیبت کو اپنے گلے لگا لیتا ہے تو اللہ کا قانون اس کو اتنی پروٹیکشن تو دیتا ہے کہ وہ زندہ رہے، کھاتا پیتا رہے لیکن سکون آشنا زندگی اس سے دور ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ اللہ سے دوری کی بنا پر اللہ کی خصوصی محبت اور دوستی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی خصوصی محبت اور اس محبت کے رستے پر چل کر اللہ کا دوست بننے کے لئے جو طریقے، قاعدے اور ضابطے بنائے گئے ہیں ان کا انکشاف روحانی علوم کرتے ہیں۔

روحانی علوم کا منشاء یہ ہے کہ آدمی ان ضابطوں اور قاعدوں سے واقف ہو جائے جن ضابطوں اور قاعدوں کے تحت ازل میں مخلوق نے اللہ کی آواز سن کر اس بات کا اقرار کیا تھا۔ ''جی ہاں'' ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ آپ ہمارے رب ہیں۔

یہ سارا کھیل جو ہمارے سامنے ہو رہا ہے، کہیں آدمی پیدا ہو رہا ہے، کہیں آدمی بچپن کے دور سے گزر رہا ہے، کہیں آدمی جوان ہو رہا ہے، کہیں آدمی جوانی کے دور کو ختم کر کے بڑھاپے میں داخل ہو رہا ہے اور بڑھاپے کے بعد کسی دوسرے عالم میں چلا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اتنا مسلسل اور متواتر ہے کہ اس کو کہیں ٹھہراؤ نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک چین گھوم رہی ہے اور اس چین کی کڑیاں کبھی بچپن کا روپ دھار لیتی ہیں، کبھی جوانی کے خدوخال اختیار کر لیتی ہیں، کبھی بڑھاپے میں منتقل ہو جاتی ہیں اور کبھی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ چین ایک ہے کڑیاں بھی ایک ہیں لیکن ہر آن ہر لمحہ ہر کڑی ایک نئے رنگ اور روپ میں جلوہ گر ہو رہی ہیں۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے کتاب لوح و قلم میں ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ ہر لمحہ اور ہر آن ازل ہے۔ یعنی اللہ نے جس طرح کن فرمایا تھا وہ کن ٹیپ ہو گیا ہے اور ٹیپ مسلسل چل رہا ہے۔ یہ ٹیپ شدہ آواز کائنات میں مسلسل گونج رہی ہے۔ انسان جب اس زمین پر وارد ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بچہ اس زمین پر پیدا ہوا، یہ اللہ کے اس عمل کا مظاہرہ ہے جس عمل کے نتیجے میں آدم کو جنت سے نکالا گیا تھا۔ ہر پیدا ہونے والا بچہ آدم ہے جب تک اس بچے نے جنت میں اللہ کی نافرمانی نہیں کی یہ بچہ زمین پر پیدا نہیں ہوا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

’’وہ ذات جس نے تمہیں تخلیق کیا ایک نفس سے۔‘‘

(القرآن)

ہمارے دانشور ایک نفس سے مراد آدم لیتے ہیں یعنی آدم، آدم سے پیدا ہوا اور آدم کی نسل بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے، سوال یہ ہے کہ آدم نے جنت میں اللہ کی نافرمانی کی۔ اس نافرمانی کی بنا پر آدم کو جنت سے نکالا گیا۔ جنت کی فضا جنت کے ماحول اور جنت نے آدم کو رد کر دیا اس لئے کہ جنت ایک ایسا ماحول ہے جس میں صرف وہ لوگ رہ سکتے ہیں جو نافرمان نہیں ہیں۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ اب سے کروڑوں سال پہلے آدم نے جنت میں نافرمانی کی اور آدم کو جنت سے نکال دیا گیا تو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کروڑوں سال پہلے آدم کی غلطی کا خمیازہ کروڑوں سال بعد پیدا ہونے والی آدم کی اولاد بھگت رہی ہے۔ غور کیا جائے تو یہ بات انصاف کے خلاف ہے۔ پریشان کن بات ہے کہ ایک کروڑ سال پہلے ہمارے آباؤ اجداد کے دادا پردادا اور ان کے دادا نے غلطی کی اور سزا آج پیدا ہونے والے بچے کو مل رہی ہے یعنی ایک راستہ چلتے آدمی نے کسی آدمی کو پتھر مارا اور اس کا سر کھل گیا۔ اس کے ساتھ چلنے والا آدمی جس کا اس واقع سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کو پکڑا اور سزا دے دی گئی۔

آدم زاد نسل اس لئے پریشان ہے کہ اس نے حقائق سے دانستہ طور پر چشم پوشی کر لی ہے جو حقائق اسے نافرمانی سے پہلے آدم کی حیثیت سے متعارف کراتے ہیں۔ کائناتی تخلیقی عمل مسلسل جاری و ساری ہے۔ جس طرح ہمارا باپ آدم جنت میں فرمانبردار بندے کی حیثیت سے رہتا تھا اور نافرمانی کا ارتکاب کر کے جنت کو چھوڑ آیا۔ اسی طرح آدم کا ہر بیٹا اور حوا کی ہر بیٹی، زمین پر آنے سے پہلے جنت میں موجود ہے۔ وہاں اپنے باپ آدم کی نافرمانی کا مظاہرہ کرتا ہے اور نتیجہ میں جنت اسے رد کر رہی ہے اور وہ زمین پر پیدا ہو رہا ہے۔

ہم روشنی کھاتے ہیں

ہم جب بندے اور خالق کے درمیان تعلق کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمیں بہت زیادہ دوری محسوس ہوتی ہے۔ یہ دوری اس لئے ہے کہ مادی زندگی کا دارومدار پابند حواس پر ہے۔ جب پابند حواس پر بندہ تفکر کرتا ہے تو اس کی سوچ بھی پابند اور مقید رہتی ہے۔ پابند اور مقید سوچ کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان کی زندگی کا محور مادیت ہے۔ آدمی کے ذہن کا ہر عمل مادے کے خول میں بند ہے۔ مثلاً کھانا پینا، گھر بنانا، سردی گرمی سے بچاؤ کے لئے لباس اختراع کرنا، ایک خاندان میں رہنا پھر اس خاندان کو چھوٹے چھوٹے خاندان میں تقسیم کر دینا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان سب عوامل کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ آدمی مادی زندگی کو اپنے اوپر کتنا مسلط کرے۔ بالآخر اسے مادی زندگی چھوڑنی پڑتی ہے۔ آدمی کے اوپر جب موت وارد ہو تو مادیت سے اس کا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ آدمی کا وجود جس کے سہارے آدمی اس دنیا میں زندگی کو چلاتا ہے اور جس میں آدمی کی تمام دلچسپیاں مرکوز رہتی ہیں مٹی بن جاتا ہے۔

ایک آدمی دن بھر میں جو کچھ کھاتا پیتا رہتا ہے ان اشیاء کا اگر ڈھائی یا تین کلو وزن فی دن متعین کر لیا جائے تو اس حساب سے آدمی کا جسم نہیں بڑھتا۔ آدمی کا جسم اگر مادی غذاؤں سے پرورش پاتا ہے اور مادہ ہی اس کی زندگی کو نشوونما دیتا ہے تو تیس پینتیس سال کی عمر میں آدمی کا وزن کئی من ہونا چاہئے۔ جبکہ ایسا نہیں ہوتا۔ پس ثابت ہوا کہ آدمی جو کچھ کھاتا ہے وہ دراصل روشنیاں کھاتا ہے یعنی جس طرح آدمی کا مادی وجود یا گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی روشنیوں کے اوپر زندہ ہے اسی طرح گیہوں میں بھی روشنیاں کام کر رہی ہیں۔ براہ راست طرز میں اس بات کو اس طرح کہا جائے گا کہ روشنی روشنی کو کھا رہی ہے۔ انسان کے اوپر روشنیوں کا بنا ہوا اصل انسان روشنیوں سے فیڈ (Feed) ہو رہا ہے اور روشنیوں سے ہی انرجی (Energy) حاصل کر رہا ہے۔ جس طرح ایک آدمی مرنے کے بعد مٹی کے ذرات میں تبدیل ہو جاتا ہے اسی طرح گیہوں کا ایک دانہ بھی مٹی میں تبدیل ہو جاتا ہے لیکن گیہوں کا دانہ روشنیوں کے جس تانے بانے پر قائم ہے وہ روشنیاں موجود رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی ٹن خوراک کھانے کے باوجود بھی وزن کئی ٹن نہیں ہوتا۔ روشنی کی معین مقدار کسی انسان، کسی حیوان، کسی درخت، کسی پرندے اور کسی گھر کے در و دیوار کی زندگی ہے۔

روشنیوں اور روشنی کے وصف کو تلاش کرنے کے لئے پہلا سبق ارتکاز توجہ ہے، ارتکاز توجہ کا مطلب یہ ہے کہ ذہن ہر طرف سے خالی اور یکسو ہو جائے۔ یکسوئی سے مراد دراصل بے خیال ہو جانا ہے۔ بے خیال ہونا کوئی ایسا عمل نہیں ہے جس کی تشریح کی ضرورت ہو۔

ہر آدمی کے اوپر چوبیس گھنٹے میں زیادہ نہیں تو چند منٹ کے لئے بے خیال ہونے کی کیفیت ضرور طاری ہوتی ہے۔اس کا دماغ تمام وسوسوں اور خیالات سے خالی ہو جاتا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دماغ بند یاماؤف ہو گیا ہے یا کہا جاتا ہے کہ دماغ خالی ہو گیا ہے۔ چونکہ ہم یکسوئی، بے خیالی اور ارتکاز توجہ کی اس کیفیت سے واقفیت نہیں رکھتے اس لئے ہم اس حالت کو بیماری سمجھتے ہیں۔

انسانی زندگی ہمہ وقت ہر آن ہر دن اور ہر شب دو رخوں پر چل رہی ہے۔جب تک زندگی دو رخوں پر نہیں چلتی زندگی قائم نہیں رہتی۔ایک رخ میں آدمی ذہنی مرکزیت سے دور ہوتا ہے اور دوسرے رخ میں آدمی ذہنی مرکزیت سے قریب ہوتا ہے۔جب ذہنی مرکزیت سے دور ہوتا ہے اس کے اوپر مادیت کا غلبہ ہوتا ہے اور جب کوئی آدمی ذہنی مرکزیت سے قریب ہوتا ہے اس کے اوپر روشنیوں کا غلبہ ہوتا ہے۔یہ دونوں رخ ایک ساتھ سفر کر رہے ہیں اور الگ الگ بھی اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ایک ساتھ سفر جاری رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان مادی حواس کے اندر رہتے ہوئے بھی روشنیوں کے حواس سے ہم رشتہ ہے اور روشنیوں کے حواس میں رہتے ہوئے بھی مادیت سے ہم رشتہ ہے۔

الگ الگ سفر کرنے سے منشاء یہ ہے کہ آدمی کے اوپر مادیت غالب آجاتی ہے یا اس کے اوپر روشنی کا غلبہ ہو جاتا ہے۔جس زندگی میں آدمی خالصتاً مادیت میں سفر کرتا ہے وہ زندگی بیداری ہے اور جس زندگی میں آدمی کے اوپر مادیت کا غلبہ ٹوٹ جاتا ہے اس زندگی کا نام نیند ہے۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات یہ ہیں کہ آدم زاد کو مادیت کے غلبے سے آزاد کر کے روشنیوں کے اندر سفر کرنے کی دعوت دی جائے اس سفر کے لئے پہلا قدم یا پہلا عمل مراقبہ ہے جو انسان کو اس راستہ سے روشناس کرتا ہے۔جو راستہ مادیت کے غلبہ سے آزاد ہے۔ مراقبہ کے ذریعے آدمی اپنے ارادے اور اختیار سے اپنے اوپر ایسی کیفیات مرتب کر لیتا ہے جن کیفیات میں مادے کا غلبہ نہیں ہوتا۔مثلاً جب آدمی سوتا ہے تو پہلا اسٹیج یہ ہے کہ آنکھوں کے اوپر ہلکا سا دباؤ محسوس ہوتا ہے پھر یہ دباؤ خمار بن جاتا ہے۔خمار میں ذراسی گہرائی پیدا ہوتی ہے تو حواس ٹوٹنے لگتے ہیں جب حواس کی شکست وریخت شروع ہوتی ہے تو آنکھوں میں پتلیوں کی حرکت ساکت ہو جاتی ہے اور آنکھوں میں پتلیوں کی حرکت کا ساکت ہونا اس بات کی علامت ہے کہ انسان بیداری کے حواس سے نکل کر نیند کے حواس میں منتقل ہو گیا ہے۔

تیسری آنکھ

ماضی، حال اور مستقبل بنیادی طور پر بیداری اور نیند ہیں۔ جب کہ سمجھایہ جاتاہے کہ نیند زندگی نہیں ہے۔ علوم ظاہر کے دانشور جب نینداور خواب کی دنیاکاتذکرہ کرتے ہیں توخواب کوایک خیالی زندگی کہہ کر گزر جاتے ہیں جب کہ خواب اور بیداری کی زندگی الگ الگ نہیں ہے۔ صرف حواس کی درجہ بندی ہے۔ بیداری کے حواس میں اپنے اوپر پابندی محسوس کرتے ہیں اور خواب کے حواس میں خود کو پابندی سے آزاد دیکھتے ہیں۔ سفر ایک ہے فرق صرف پابندی اور آزادی کا ہے۔

مراقبہ انسان کو حواس کے دونوں رخوں سے متعارف کراتا ہے۔ متعارف ہونے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی اعصابی تھکان کی وجہ سے ارادتاً پابندی کے حواس سے ہٹ کر ایسے حواس میں قدم رکھنا چاہتا ہے جہاں پابندی نہیں ہے۔

آدمی اعصابی تھکان کی وجہ سے جب سکون چاہتا ہے اور دنیاوی آلام و مصائب اور رنج و غم سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے تو طبیعت اسے اس زندگی میں لے جاتی ہے جس زندگی کا نام نیند ہے۔ رات اور دن کے شعور میں ردوبدل کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی اعصابی طور پر بے بس ہو کر سو جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اعصابی سکون کے ساتھ اپنے ارادے اور اختیار سے بیدار رہتے ہوئے نیند کے حواس میں منتقل ہو جائے۔ جس مناسبت سے نیند کے حواس بیداری میں منتقل ہوتے ہیں اسی مناسبت سے ماورائی حواس میں ترقی شروع ہو جاتی ہے۔

آدمی سونے کے لئے لیٹتا ہے تو سب سے پہلے اس کے اعصاب کا کھنچاؤ نرمی اور خمار میں منتقل ہوتا ہے۔ یہ خمار جب ذرا گہرا ہوتا ہے تو آنکھوں میں ہلکی سی کھٹک ہوتی ہے اور آنکھوں میں پتلیوں کی حرکت بتدریج کم ہو کر ساکت ہو جاتی ہے۔ خمار میں جیسے ہی گہرائی واقع ہوتی ہے آدمی غنودگی کے عالم میں چلا جاتا ہے۔ غنودگی کا مطلب یہ ہے کہ شعوری حواس لاشعوری حواس میں منتقل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ غنودگی جب اپنے عروج کو پہنچتی ہے یعنی شعوری حواس لاشعور میں منتقل ہو جاتے ہیں تو آدمی سو جاتا ہے۔ یہ زندگی کا روٹین اور مسلسل عمل ہے جو ہر ذی روح کی زندگی میں جاری ہے۔ جس طرح ایک آدمی محنت و مشقت، کام کاج، ذہنی انتشار اور اعصابی تھکان کی وجہ سے سونے پر مجبور ہے اسی طرح بکری، بلی، کبوتر، چڑیا، مچھلی بھی شعوری حواس سے منتقل ہو کر لاشعوری حواس میں منتقل ہونے پر مجبور ہے۔ بیداری کے بعد سونے اور سونے کے بعد بیدار ہونے کا عمل ہر مخلوق میں موجود ہے۔

آدم کو اللہ کریم نے اپنی صفات کا وہ علم عطا کیا ہے جو علم دوسری مخلوقات کو عطا نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم سب کا سب غیبی انکشافات ہیں۔ غیبی انکشافات سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے بندے کے اندر ایسی صلاحیتیں منتقل کر دی ہیں جن صلاحیتوں کو استعمال کر کے بندہ غیب کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ اللہ چونکہ یہ چاہتا ہے کہ بندہ غیب کی دنیا میں اللہ کی صناعی کا مشاہدہ کرے اور اللہ کی صفات کا عرفان حاصل کرے اس لئے یہ ضروری ہو گیا کہ بندہ کے اندر ایسی صلاحیتیں موجود ہوں جن صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر خالق کائنات کا منشاء پورا ہو۔

پابند زندگی بیداری ہے اور آزاد زندگی نیند کی دنیا ہے۔ کوئی بھی انسان مراقبہ کے ذریعہ بڑی آسانی کے ساتھ خواب یا نیند کی دنیا میں داخل ہو سکتا ہے۔

مراقبہ دراصل بیداری کے حواس میں رہتے ہوئے خواب دیکھنا ہے یعنی ایک آدمی بیدار ہے جاگ رہا ہے، شعوری حواس کام کر رہے ہیں، زمین کے ارد گرد موجود ماحول اور فضا سے متاثر بھی ہو رہا ہے اور خواب بھی دیکھ رہا ہے۔

مثال:

ایک شخص اپنے جگری دوست کو خط لکھتا ہے۔ خط لکھنے میں اس کا دماغ بھی کام کرتا ہے اس کا ہاتھ بھی چلتا ہے وہ جس ماحول میں موجود ہے وہاں پھیلی ہوئی آوازیں بھی سنتا ہے۔ کوئی آدمی اگر بات کر رہا ہے اس بات کا مفہوم بھی اس کے ذہن میں منتقل ہو رہا ہے، کوئی اس سے سوال کرتا ہے تو وہ اس کا جواب بھی دیتا ہے۔ فضا میں خنکی ہے تو سردی محسوس کرتا ہے، گرمی ہے تو گرمی کو بھی محسوس کرتا ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود خط لکھتا ہے تو شعور میں الفاظ کے معنیٰ اور مفہوم بھی منتقل ہوتا رہتا ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ ایک آدمی بیک وقت اپنے اندر چھپی ہوئی کئی صلاحیتوں کو بیک وقت استعمال کر رہا ہے۔ بالکل اسی طرح کوئی بندہ بیداری میں رہتے ہوئے نیند اور خواب کے خواص کو بھی اپنے اوپر منعکس کر لیتا ہے۔ اس کے اندر لاشمار صلاحیتیں متحرک ہو جاتی ہیں۔ وہ بیدار زندگی میں رہتے ہوئے بھرپور ماورائی حواس کے ساتھ غیب کی دنیا میں شب و روز گزارتا ہے۔

مراقبہ کے مدارج

غیب کی آزاد دنیا میں شعوری سطح پر یالاشعوری سطح پر سفر کرنا مراقبہ ہے۔

قانون:

سونے سے پہلے آدمی کے اوپر تین کیفیات وارد ہوتی ہیں۔ پہلی کیفیت پر سکون ہونا، دوسری کیفیت خمار اور تیسری کیفیت نیند ہے۔

جب کوئی آدمی بیدار رہتے ہوئے مراقبہ کی زندگی کو اپنے لئے مشعل راہ بناتا ہے تو اس کے اوپر بھی ابتدائی تین کیفیات وارد ہوتی ہیں۔ پہلے اس کے اوپر ہلکی سی نیند کا غلبہ ہوتا ہے اس کیفیت کا نام غنود ہے یعنی سالک نے بیداری کے حواس میں رہتے ہوئے کوئی ایسی چیز جو عام آدمی کو کھلی آنکھ سے نظر نہیں آتی۔ دیکھنے میں ایک ایسا پردہ حائل ہو گیا جس پردے نے اس چیز کو بھلا دیا۔ مسلسل مراقبہ کرنے سے شعور کے اندر سکت پیدا ہو جاتی ہے اور بیداری کے حواس میں بند آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیزیں نسبتاً زیادہ یاد رہنے لگتی ہیں۔ لیکن ذہن کی رفتار اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ان دیکھی ہوئی چیزوں کا آپس میں ربط قائم نہیں ہوتا۔ ایک طرف ذہن زمین کی چیز دیکھتا ہے دوسری طرف آسمان کی چیز دیکھتا ہے اس کیفیت کا اصطلاحی نام ''ورود'' ہے۔ جب دیکھی ہوئی چیزیں زیادہ روشن اور واضح ہونے لگتی ہیں اور جو مناظر باطنی آنکھ کے سامنے آتے ہیں وہ یاد رہتے ہیں لیکن مناظر کے پس منظر میں جو مفہوم ہے وہ ذہن نشین نہیں ہوتا اور دیکھنے کے بعد آدمی اپنی عقل سے اس میں معنی پہنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی معنی صحیح بھی ہوتے ہیں اور غلط بھی ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر اس میں غلطی کا امکان ہے۔ اس صلاحیت کا نام مکاشفہ ہے۔ مکاشفے کی صورت یہ ہے کہ آدمی عالم مراقبہ میں جو چیزیں دیکھتا ہے اس کا مفہوم بھی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ مکاشفہ کی کیفیت مراقبہ کے بغیر بھی عمل میں آسکتی ہے۔ آدمی اگر ارادی یا غیر ارادی طور پر یکسو ہو جائے تو بہت دور پرے کی باتیں اس کے دماغ میں آنے لگتی ہیں لیکن اس طرح دماغ کی اسکرین پر مناظر کی عکاسی شعور کے لئے بار بنتی ہے اور سالک اس بار کو برداشت نہیں کرتا۔ عقلی اور شعوری طور پر وہ بے خبر ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ کیفیت اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے جیسے جیسے مکاشفے کی صلاحیت طاقتور ہوتی ہے اسی مناسبت سے شعوری سکت بڑھتی رہتی ہے۔ لاشعوری اطلاعات اور تحریکات کو قبول کرتے ہوئے شعور کوئی وزن محسوس نہیں کرتا۔ شعور جب اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ لاشعوری تحریکات کو قبول کرنے میں دباؤ محسوس نہ کرے، دماغ کے اوپر بے خبری طاری نہ ہو اور آدمی کے اعصاب بیدار زندگی کی طرح کام کرتے رہیں تو یہ مکاشفے کے بعد کی دوسری کیفیت ہے۔ اس کیفیت کا نام مشاہدہ ہے۔ مشاہدے سے مراد ہے کہ

ایک آدمی زمین پر بیٹھے ہوئے زمین کے اوپر موجود چیزیں بھی دیکھتا ہے۔ زمین کے اوپر موجود اشیاء سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔ اپنی غذائی ضروریات بھی پوری کرتا ہے اور باطنی طور پر ماورائی دنیاؤں کی سیر بھی کرتا ہے۔

مشاہدے کی یہ کیفیت آدمی کو عالم اعراف میں لے جاتی ہے۔ عالم اعراف وہ عالم ہے جہاں دنیا کے باسی مرنے کے بعد جا بستے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ عالم اعراف اور اس دنیا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح دنیا میں کوئی فرد کھاتا پیتا ہے، سوتا جاگتا ہے، ہنستا روتا ہے، غمگین اور خوش ہوتا ہے۔ اس کے اندر محبت کا طوفان اٹھتا ہے یا اس کے اندر نفرت کا لاوا اُبل پڑتا ہے، جس طرح کسی بندے کو دنیا میں دوستوں کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ دوستوں کے کام آتا ہے اور دوست اس کے کام آتے ہیں، جس طرح اسے دنیا میں سردی اور گرمی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے وسائل کی احتیاج ہوتی ہے۔ اسی طرح عالم اعراف کی زندگی میں وہ کھاتا پیتا ہے، سوتا جاگتا ہے اور زندگی کی ساری ضروریات پوری کرتا ہے۔ اگر اس عالم رنگ و بو (عالم ناسوت) میں آدم کو سر چھپانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو اس عالم میں بھی چھت کے نیچے رہتا ہے۔ جس طرح اس زمین پر مکانات اور بلڈنگیں ہیں اس ہی طرح عالم اعراف میں بھی مکانات اور بلڈنگیں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں وسائل حاصل کرنے کے لئے اجتماعی یا انفرادی تگ و دو نہیں کرنی پڑتی۔

عالم اعراف کی دنیا اتنی خوبصورت ہے کہ اگر آدم زاد اس کو دیکھ لے تو اس تنگ و تاریک مادی دنیا کی حیثیت اس کے سامنے کچھ نہیں رہتی۔ جب کوئی بندہ عالم مشاہدہ میں داخل ہونے کے بعد عالم اعراف کا نظارہ کر لیتا ہے تو اس کے اوپر سے کشش ثقل ٹوٹ جاتی ہے۔ کشش ثقل ٹوٹ جانے سے مراد یہ نہیں ہے کہ بندہ لطیف ہو کر ہوا میں اڑ جاتا ہے۔ کشش ثقل ٹوٹ جانے سے مراد یہ ہے کہ اس کے اندر حرص و حوس نہیں رہتی۔ مال و زر کی محبت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ مال و زر کی فراوانی سے جو کبر و نخوت اور شیطانیت پیدا ہوتی ہے اس سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت اس بندے کا یقین بن جاتی ہے کہ بہر حال مجھے اس دنیا سے اس دنیا میں منتقل ہونا ہے۔

نوٹ:

استدراجی علوم کی معراج مراقبہ میں غنود اور ورود تک ہے۔ یہ لوگ متواتر اور مسلسل مشقوں سے اپنے اندر غنود اور ورود کی صلاحیتوں کو اتنا بیدار کر لیتے ہیں کہ ان سے بہت ساری خرق عادات کا ظہور ہونے لگتا ہے۔

رفتار

جب کوئی مر جاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ آدمی ختم ہو گیا ہے۔ حالانکہ انتقال ہونے کا مطلب ختم ہونا نہیں بلکہ ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہو جانا ہے۔ یعنی آدمی گوشت پوست کے جسم کو چھوڑ کر دوسرے عالم میں منتقل ہو گیا۔ لفظ مرنے کا ترجمہ بھی امر ہونا ہے۔

اب ہم یوں کہیں گے کہ آدمی اس عارضی زندگی کو چھوڑ کر ایسے عالم میں چلا گیا ہے جہاں اسے دنیا سے زیادہ طویل عمر تک رہنا ہے۔ روحانی طور پر مرنا اور جسمانی طور پر مرنا بظاہر ایک جیسی دو حالتیں نظر آتی ہیں لیکن ان دو حالتوں میں فرق ہے۔ ایک آدمی اس جسم کی موجودگی میں اپنے ارادے اور اختیار کے ساتھ جسم کو چھوڑ کر مر جاتا ہے اور دوسری حالت یہ ہے کہ آدمی اس جسم کو اس طرح چھوڑ دیتا ہے کہ پھر اس جسم کی اپنی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

مثال:

جب ہم سو جاتے ہیں تو خواب دیکھتے ہیں۔ خواب کی حالت میں خود کو ہزاروں میل کے فاصلے پر دیکھتے ہیں۔ وہاں جو چیز کھاتے ہیں اس کا مزہ بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس ملک کا جو موسم ہے اس کے اثرات کو بھی قبول کرتے ہیں۔ کسی گرم ملک میں رہنے والا آدمی یہ خواب دیکھتا ہے کہ وہ برف پوش پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہے، سردی سے اس کے دانت بج رہے ہیں، اتنی زیادہ سردی محسوس ہوتی ہے کہ جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو سردی کے تمام اثرات اس پر غالب ہوتے ہیں اور اس کے اوپر کپکپی طاری ہوتی ہے۔

ہر آدمی ایک دو یا زیادہ خواب ایسے ضرور دیکھتا ہے کہ اس کی ملاقات عزیزوں رشتے داروں سے ہوتی ہے۔ مرے ہوئے لوگوں کی روحوں سے ملاقات اس بات کی نشاندہی ہے کہ آدمی عالم اعراف میں منتقل ہو گیا ہے۔

روحانیت کا منشاء بھی یہی ہے کہ آدمی کے اندر وہ صلاحیت بیدار ہو جائے جو خواب میں کام کرتی ہے۔ وہ صلاحیت متحرک ہو جائے جو آدمی کو زمان و مکان سے آزاد کر دیتی ہے۔

رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

موتو قبل انت موتو

مر جاؤ مرنے سے پہلے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ عالم ناسوت کی زندگی میں رہتے ہوئے زمان و مکاں (Space&Time) کی گرفت سے آزاد ہو کر اس عالم کا مشاہدہ کر لیا جائے جہاں عالم ناسوت کی طرح زمانیت اور مکانیت کی پابندی نہیں ہے۔ جس ذہنی کیفیت میں انسان سوتا ہے۔

۱) سونے میں سب سے پہلے جو عمل سرزد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی نہایت آرام و سکون کے ساتھ بستر پر لیٹ جاتا ہے۔

۲) آدمی دوسرا کام یہ کرتا ہے کہ ذہن اور دماغ کو بیداری کے حواس سے ہٹا کر ان حواس میں منتقل کر دیتا ہے جن حواس کا نام نیند ہے۔

۳) تیسرا قدم یہ اٹھاتا ہے کہ آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

۴) چوتھا قدم یہ ہے کہ وہ سو جاتا ہے۔

آیئے! بیداری میں سونے کی مشق کرتے ہیں۔ پرسکون ہو کر آرام سے بیٹھ جایئے۔ ذہن کو تمام دنیاوی خیالات سے آزاد کر لیجئے۔ آنکھیں بند کر کے شعور سے لاشعور میں داخل ہو جایئے۔ جیسے ہی شعور کی گرفت کمزور پڑے گی بند آنکھوں کے سامنے لاشعور کا دروازہ آئے گا۔

یہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جایئے۔ اب آپ عالم اعراف (ماورائی دنیا) میں ہیں جس طرح کوئی مسافر کسی بڑے شہر میں داخل ہوتا ہے اسی طرح آپ بھی عالم اعراف (ماورائی دنیا) کے ایک بڑے شہر میں ہیں یہاں بھی آپ کو آبادیاں نظر آ رہی ہیں۔

عالم ناسوت (مادی دنیا) میں روح گوشت پوست اور ہڈیوں سے ہمارا وجود بناتی ہے یعنی گوشت پوست اور ہڈیوں کا تانا بانا مٹی کے ذرات سے بنتا ہے اور عالم اعراف میں روح جو گوشت پوست اور ہڈیوں کا لباس بناتی ہے اس کا تانا بانا روشنیوں کا ہوتا ہے۔ مٹی میں وزن ہوتا ہے۔ مٹی کشش ثقل کا دوسرا نام ہے اس لئے آدمی اس زمین پر خود کو پابند دیکھتا ہے۔ عالم اعراف میں چونکہ جسم روشنیوں کے تانے بانے سے بنا ہوا ہے اس لئے آدمی خود کو پابند اور مجبور نہیں دیکھتا۔ پابند دنیا میں سفر کرنے کے لئے پابند وسائل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ رفتار تیز اور کم ہو سکتی ہے لیکن وسائل سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ ایک گھنٹے میں پیدل تین میل کا سفر طے ہوتا ہے یہی سفر سائیکل پر سوار ہو کر کیا جائے تو چار پانچ میل فی گھنٹہ ہو جاتا ہے۔ موٹر کار میں بیٹھ کر ساٹھ ستر اور اسی میل ہو جاتا ہے۔ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ہزاروں میل کا سفر طے ہو جاتا ہے۔ جس طرح رفتار کی تیزی اپنی جگہ مسلم ہے اسی طرح وسائل کی محتاجی بھی مسلم ہے۔ بندہ اس لئے محتاج ہے کہ اس کا جسم مٹی کا بنا ہوا ہے اور جتنے وسائل ہیں وہ بھی مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔ سائیکل مٹی کے علاوہ کچھ نہیں ہے اس لئے کہ سائیکل کے اندر جتنے کل پرزے ہیں وہ سب لوہے سے مرکب ہیں اور لوہا مٹی ہے مٹی کو کٹھالی میں پکایا جاتا ہے تو مٹی کے مخصوص ذرات سیال بن کر لوہا بن جاتے ہیں۔ جہاز میں جتنے کل پرزے ہیں وہ بھی مٹی ہیں۔ دنیا کے کسی خطے پر کوئی بھی دھات ہو اس کا بنیادی مسالہ یا خام مال (Raw Material) مٹی ہے۔ مٹی اپنی شکل بدلتی رہتی ہے۔ مٹی کے ذرات کہیں آدمی بن جاتے ہیں کہیں سائیکل بن جاتے ہیں کہیں موٹر سائیکل بن جاتے ہیں کہیں

ہوائی جہاز بن جاتے ہیں اور یہی مٹی کے ذرات خوبصورت درخت بن جاتے ہیں۔ایک چھوٹے سے چھوٹا ذرہ کبھی وائرس بن جاتا ہے۔ کبھی چیونٹی بن جاتا ہے اور کبھی ہاتھی بن جاتا ہے۔ یہ ذرات اللہ کریم کی صناعی اور قدرت کی واضح نشانیاں ہیں۔اس صناعی کے بارے میں اللہ کریم نے ارشاد فرمایا ہے کہ :

''ہماری نشانیوں پر غور کرو۔''

اور وہ لوگ قابل ستائش ہیں اور منزل رسیدہ ہیں اور اللہ کے لئے پسندیدہ ہیں جو اللہ کی نشانیوں پر غور کرتے ہیں۔ مٹی کو گوند بنا کر ہر شکل بنائی جا سکتی ہے۔ مٹی کے گارے سے آپ چڑیا بھی بنا سکتے ہیں، مٹی کے گارے سے آپ عمارت بھی کھڑی کر سکتے ہیں، مٹی کے گارے سے آپ انسانی پتلا بھی بنا سکتے ہیں اور مٹی سے آپ بڑی سے بڑی تخلیق بھی عمل میں لا سکتے ہیں۔

علم حاصل کرنے کی دو طرزیں ہیں۔ایک طرز یہ ہے کہ آپ زمان و مکاں میں بند ہو کر وسائل کا کھوج لگائیں اور وسائل میں تفکر کریں۔ تفکر جتنا زیادہ گہرا ہوتا ہے اسی مناسبت سے صلاحیتیں بیدار اور متحرک ہو جاتی ہیں۔

تقاضے کہاں بنتے ہیں

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اس کا تانا بانا ان اجزا پر مشتمل ہے۔ جن سے خود آنکھ بنتی ہے۔ آنکھ کا دیکھنا ایک صفت ہے جس کو جتنا زیادہ صاف اور شفاف کر لیا جائے اسی مناسبت سے آنکھ کسی چیز کو واضح اور روشن دیکھتی ہے۔ صحت مند آنکھ جتنے عکس قبول کرتی ہے۔ ان کے خدوخال زیادہ واضح ہوتے ہیں۔ بیمار آنکھ جتنے عکس قبول کر کے دماغ کی سکرین پر پھینکتی ہے بیماری کی مناسبت سے اسی قدر عکس دھندلا اور غیر واضح ہوتا ہے۔ آنکھ کی ایک بیماری یہ ہے کہ آنکھ کے اندر موجود لینس (جس لینس کے اوپر عکس کو قبول کرنے کا دارومدار ہے) اگر ناکارہ ہو جائے تو آنکھ عکس کو قبول نہیں کرتی۔ کیمرہ کتنا ہی اچھا اور قیمتی ہو اگر اس کے اندر لگا ہوا لینس خراب ہے تو تصویر اچھی نہیں بنتی۔

انسانی جسم دو ہیں۔ انسان کا ایک جسم ایسا ہے جس کے اندر جگہ جگہ خراشیں پڑی ہوئی ہیں۔ ہر عضو ٹوٹا ہوا ہے ہر جوڑ پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ ایسا جسم ناکارہ، بدصورت اور بدہئیت ہوتا ہے۔ انسانی جسم کی طرح انسان کے اوپر ایک اور جسم ہے جو گوشت پوست کے جسم کے اوپر روشن اور لطیف جسم ہے۔ اس جسم کے بہت سے نام ہیں، بے شمار ناموں میں دو نام زیادہ مشہور ہیں ایک جسم مثالی، دوسرا نسمہ (Aura)۔ انسانی گوشت پوست کے جسم کا دارومدار نسمہ (Aura) کے اوپر ہے۔ نسمہ (Aura) اگر صحت مند ہے تو گوشت پوست کا جسم بھی صحت مند ہے۔ یوں سمجھئے کہ جس طرح گوشت کے جسم میں دو لینس فٹ ہیں جن کے ذریعے مادی دنیا میں موجود تمام چیزوں کا عکس دماغ کی اسکرین پر منتقل ہو کر ڈسپلے ہوتا ہے اسی طرح جسم مثالی کے اندر جو کچھ موجود ہے اس کا تمام تر اثر گوشت پوست کے جسم پر مرتب ہوتا ہے۔ روشنیوں سے بنا ہوا یہ جسم صرف انسان کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ زمین کے اوپر جتنی مخلوق موجود ہے سب ہی اس روشنیوں کے جسم (Aura) (کی ذیلی) تخلیق ہیں۔

اس بات کو ذرا تفصیل سے بیان کیا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ انسانی زندگی میں جتنے تقاضے موجود ہیں یہ تقاضے گوشت کے جسم میں پیدا نہیں ہوتے۔ جسم مثالی میں پیدا ہوتے ہیں اور وہاں سے منتقل ہو کر گوشت پوست کے جسم پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی روٹی کھاتا ہے تو بظاہر ہم دیکھتے ہیں کہ گوشت پوست کا آدمی روٹی کھا رہا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ جب تک جسم مثالی کے اندر بھوک کا تقاضہ پیدا نہیں ہو گا اور جسم مثالی گوشت پوست کے جسم کو بھوک یا پیاس کا عکس منتقل نہیں کرے گا آدمی روٹی نہیں کھا سکتا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آئے۔ ذرا سے تفکر سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے۔

جسم مثالی کے بہت سے پرت ہیں۔ جب ہم خواب کے حواس میں دنیا بھر کی سیر کرتے ہیں اور تمام وہ اعمال واشغال ہم سے سرزد ہوتے ہیں جو ہم گوشت پوست کے جسم کے ساتھ کرتے ہیں تو یہ جسم مثالی کی وہ حرکت ہے جو گوشت پوست کے جسم کو میڈیم بنائے بغیر کرتا ہے۔

جسم مثالی کی حرکات وسکنات کے تاثرات ایک جیسے ہوتے ہیں۔ تمام آسمانی صحائف نے خوابوں کو مستقبل بینی کا ایک روشن ذریعہ بتایا ہے۔ مستقبل بینی سے مراد ٹائم اسپیس سے ماوراء اس عالم میں دیکھ لینا ہے جو عالم ہماری مادی آنکھوں کے سامنے نہیں ہے۔

روشنی کا جسم (Aura) اگر مٹی کے ذرات سے اپنا رشتہ منقطع کر لے تو یہ ذرات فنا ہو جاتے ہیں۔ صاحب مراقبہ جب پہلی سیڑھی سے قدم اٹھا کر دوسری سیڑھی پر رکھتا ہے تو اس کے سامنے جسم مثالی آجاتا ہے اور اس کے اندر یقین کا وہ پیٹرن کھل جاتا ہے جو جانتا ہے کہ مٹی کے ذرات سے بنے ہوئے گوشت پوست کی حیثیت محض عارضی اور فانی ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ مرنے والے آدمی کے جسم کے اوپر جو روشنیوں کا جسم ہے اس نے عارضی مادی جسم سے رشتہ منقطع کر لیا ہے۔۔۔۔۔۔ یعنی مرنے سے مراد یہ ہے کہ مٹی کے ذرات سے بنے ہوئے گوشت پوست کے آدمی کے اوپر روشنیوں کا جسم اس عالم آب و گل سے رشتہ منقطع کر کے اس عالم رنگ و نور میں منتقل ہو گیا ہے۔

جنت ودوزخ کے طبقات

اللہ کریم نے اپنے محبوب ﷺ سے فرمایا کہ یہ لوگ تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے اور جو کچھ تمہیں علم دیا گیا ہے وہ قلیل ہے یعنی روح کا علم تو دیا گیا ہے لیکن اللہ کے علم کے مقابلے میں اس کی حیثیت قلیل ہے۔یعنی روح کا علم تو دیا گیا ہے لیکن اللہ کے علم کے مقابلے میں اس کی حیثیت قلیل ہے۔یہاں ایک نقطہ زیر بحث آتا ہے۔ اللہ خود ماوراہے اللہ کا علم لامحدود،لامتغیر،لامتناہی اور ماوراالماوراہے۔لامتناہی علم کا قلیل سے قلیل جزو بھی لامتناہیت کے دائرے میں آتا ہے اس لئے اس کو بھی اور لامتناہی کے قلیل جزو کو بھی،لامتناہی علم ہی کہا جائے گا۔

اس آیت مبارکہ کا یہ مفہوم ہر گز نہیں ہے کہ روح کا علم نہیں دیا گیا۔رسول اللہ ﷺ کے نائب اولیاء اللہ کو بھی یہ علم منتقل ہوا ہے۔یہ علم کس کو کس قدر منتقل ہوا ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔بہر حال لامتناہی علم کا چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی لامتناہی ہوتا ہے۔

روحانی نقطہ نظر سے زندگی اور موت کی تشریح کی جائے تو یہ کہا جائے گا کہ روح کے بنائے ہوئے جسم مثالی نے مٹی کے جسم کو اس طرح چھوڑ دیا کہ مٹی کے جسم سے اپنا رشتہ کلیتاً توڑ لیا اور اس ناسوتی عالم کے تقریباً دو سو میل اوپر کی فضا میں بکھری ہوئی روشنیوں سے ایک اور جسم تخلیق کر لیا۔ناسوتی فضا سے دو سو میل اوپر فضا میں جو عالم موجود ہے اس عالم کو عالم اعراف کہا جاتا ہے۔یہی وہ عالم اعراف ہے جہاں آدم سے لے کر اب تک اور قیامت تک لوگ مرنے کے بعد منتقل ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔جسم مثالی کو روح جس طرح ہر وقت اور ہر آن متحرک رکھتی ہے اس طرح عالم اعراف میں بھی روشنیوں کا جسم ہر وقت اور ہر آن متحرک رہتا ہے۔عالم اعراف کے بعد ایک اور عالم ہے اس عالم میں بھی جسم متحرک رہتا ہے۔اس عالم کو ''عالم حشر و نشر'' کہتے ہیں۔عالم حشر و نشر کی فضا عالم ناسوت اور عالم اعراف سے یکسر مختلف ہے۔وہاں روشنیوں کا ہالہ عالم اعراف سے زیادہ طاقتور ہے۔عالم حشر و نشر میں ذہنی رفتار اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ جسم مثالی کی ریکارڈ کی ہوئی زندگی سامنے آجاتی ہے۔

عالم حشر و نشر کے بعد عالم یوم المیزان ہے۔عالم یوم المیزان میں روشنیوں کے بنے ہوئے اجسام کے اوپر نور کا ہالہ بن جاتا ہے یہی وہ نور ہے جس نور سے کوئی بندہ اللہ کریم کا دیدار کر سکتا ہے۔

ترجمہ:

''کوئی آنکھ ادراک نہیں کر سکتی اللہ خود ادراک بن جاتا ہے۔''

(القرآن)

جب کوئی بندہ اللہ کے ادراک سے دیکھتا ہے تو اس کی نظر عالم یوم المیزان پر پڑتی ہے۔ عالم یوم المیزان کے بعد جنت یا دوزخ کے عالمین ہیں۔ جنت کے بھی بہت سارے طبقات ہیں اور دوزخ کے بھی بہت سارے طبقات ہیں۔ جنت اور دوزخ کا تذکرہ اس بات کی شہادت ہے کہ آدمی دوزخ میں تکلیف محسوس کرے گا اور جنت میں آرام و آسائش سے لطف اندوز ہوگا۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ لطف و آسائش اور آرام روح کو حاصل ہوتا ہے اور اس آرام سے روح فائدے اٹھاتی ہے تو پھر یہ بھی کہنا پڑے گا کہ دوزخ کا عذاب بھی روح کے اوپر ہوتا ہے اور یہ بات کسی بھی طرح صحیح نہیں ہے کیونکہ روح فی الواقع اللہ کا ایک حصہ ہے۔ ایسا حصہ جو لا تجزا ہے۔ ایسا جو لا متناہی ہے اور جو ماوراالماورا ہے۔ روح نقش و نگار میں محدود نہیں ہے۔ روح یہ جانتی ہے کہ خالق کائنات کی مشیت کیا ہے۔ خالق کائنات کی مشیت اور منشاء کے مطابق خود کو نئے نئے لباسوں میں ظاہر کرتی ہے اور ہر لباس کو اس کی موجودگی اور اس کی انا سے مطلع کرتی رہتی ہے۔ یہی وہ اطلاع (Information) ہے جس کے اندر معانی پہنانا ''اختیار'' ہے۔ سزا ہو یا جزا دونوں کا تعلق اطلاع (Information) سے ہے اور اطلاع کا نزول روح کے تخلیق کردہ جسم پر ہوتا ہے۔ روح جزا و سزا تکلیف و راحت سے مبرا ہے۔

اس کونے سے اس کونے تک

جب تک ہمیں کسی چیز کا علم حاصل نہیں ہوتا ہم اس چیز سے واقف نہیں ہوتے اور علم کے لئے ضروری ہے کہ اس کا کوئی منبع (Source)ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس Sourceسے حاصل شدہ علوم کے لئے ایسی ایجنسی موجود ہو جہاں علم ذخیرہ ہو۔اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسی ایجنسی موجود ہو جو اس کے اندر معانی پہنا سکے اور آخری حد میں ایک اور ایسی ایجنسی کا موجود ہونا لازم ہے جس پر علم کا مظاہرہ ہو۔

مثال:

آدمی کو بھوک لگی یعنی اس کو یہ اطلاع ملی کہ اب جسم کو کچھ کھانے کی ضرورت ہے۔ جس ایجنسی نے یہ اطلاع قبول کی اس نے اس علم کے اندر معنی پہنائے وہ یہ کہ روٹی کھانی چاہئے۔ پھل کھانے چاہئیں وغیرہ وغیرہ اور اس اطلاع کو جسم مثالی نے قبول کر کے مظاہرہ کیا اور آدمی نے یہ محسوس کیا کہ اس نے روٹی کھالی ہے۔

جہاں تک جسمانی تقاضے پورے کرنے کا تعلق ہے وہ عالم ناسوت ہو، عالم اعراف ہو یا عالم جنت و دوزخ ہو ایک ہی طرح کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ جنت اس لئے جنت ہے کہ وہاں دودھ اور شہد کی نہریں ہیں۔ جنت میں پھل ہیں اور آدمی کی آسائش اور آرام کے لئے بے شمار وسائل مہیا ہیں۔

دوزخ اس لئے دوزخ ہے کہ وہاں ایسے حالات میں آدمی زندگی گزارتا ہے جن حالات کی علمی حیثیت تکلیف ہے۔ کھانا جنت میں بھی میسر ہے اور کھانا دوزخ میں بھی میسر ہے۔ جنت کا کھانا دودھ، شہد، پھل ہیں۔ دوزخ کا کھانا ایسی غذائیں ہیں جن سے آدمی کے اندر کراہت پیدا ہوتی ہے۔

قانون:

کھانے کا علم دونوں جگہ موجود ہے۔ کھانے کے اسباب اور سامان بھی دونوں جگہ موجود ہیں لیکن دونوں جگہ معنویت الگ الگ ہے۔

جنت کا کھانا اس لئے اچھا ہے کہ اس میں معنویت اچھی ہے۔ دوزخ کا کھانا اس لئے اچھا نہیں ہے کہ اس کے اندر پشیمانی، تکلیف اور آہ وبکا ہے۔ مختصر طور پر اس بات کو اس طرح کہا جائے گا کہ یہ ساری کائنات دراصل علم ہے اور علم کی طرزیں یہ ہیں کہ اس میں معنی پہنائے جاتے ہیں۔

جسم مثالی ایک ایسی ایجنسی ہے جو علم میں معنی پہناتی ہے۔ جب آدمی عالم ارواح سے نزول کر کے اس دنیا میں آتا ہے تو جسم مثالی اس عالم کے اندر ایسے معنی اور مفہوم اخذ کرتا ہے جس میں آدمی قید بہ بند ہے۔ ہر ہر قدم قید و بند میں جکڑا ہوا ہے۔ جسم مثالی جب عالم ناسوت سے باالفاظ دیگر اس گوشت کے جسم سے اپنا رشتہ منقطع کر کے دوسرے عالم میں جاتا ہے اور وہاں کی فضا اور ماحول سے اپنے لئے ایک نیا لباس بناتا ہے تو اس کے معنی اور مفہوم بدل جاتے ہیں۔ اس عالم کے معنی اور مفہوم میں ٹائم اور اسپیس اتنا مختصر ہو جاتا ہے کہ تقریباً اس کی نفی ہو جاتی ہے لیکن ٹائم اسپیس کلیتاً ختم نہیں ہوتا۔ ایسا اس لئے نہیں ہوتا کہ عالم ناسوت کی طرح اعراف میں بھی یہی زمین ہے اور عالم ناسوت کی طرح عالم اعراف میں بھی گھر ہیں۔ وہاں آدمی کھانا بھی کھاتا ہے، پانی بھی پیتا ہے، چلتا پھرتا ہے، اپنے عزیز واقربا سے ملاقات کرتا ہے، خوش ہوتا ہے اور روتا بھی ہے۔ خوش ہونا یا غمگیں ہونا، گھروں میں رہنا، چلنا پھرنا، دھوپ کی تپش محسوس کرنا اور موسم کے ردوبدل میں زندگی گزارنا ٹائم اسپیس کے حدود کی نفی نہیں کرتا البتہ انسانی زندگی کی رفتار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

مثال:

ایک آدمی کراچی میں مر گیا اس کے عزیز واقربا دہلی میں ہیں۔ عالم اعراف میں رہنے والا کوئی بندہ جب اپنے عزیزوں سے ملنے دہلی جائے گا تو ٹائم اسپیس مختصر ہو کر دو قدم بن جائے گی مگر قدم موجود ہیں، زمین موجود ہے لہٰذا ٹائم اسپیس بھی موجود ہے۔ جیسے جیسے آدمی اس عالم سے اس عالم میں اور دوسرے عالمین میں منتقل ہوتا رہتا ہے اس کی رفتار بڑھتی رہتی ہے اور ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ اس کا ایک قدم عالم ناسوت میں ہوتا ہے اور دوسرا قدم عرش معلیٰ پر ہوتا ہے۔

علم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اگر بندہ پابند اور مجبور ہو کر ایک گھنٹے میں تین میل کا فاصلہ طے کرنا چاہے تو اس کی رفتار کم ہو جاتی ہے اور اگر آدمی آزاد اور خود مختار ہو کر فاصلے کی نفی کر دے تو ایک قدم کے بعد اس کا دوسرا قدم آسمان پر پڑتا ہے۔

زمین پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے ارادہ کیا کہ میں عرش معلیٰ پر اللہ کریم کے حضور سجدہ ریز ہوں تو اس ارادہ کے ساتھ اس کے سامنے یہ بات مشاہدہ بن جاتی ہے کہ اللہ اپنی صفات حمیدہ کے ساتھ عرش پر متمکن ہے اور بندہ اس کے سامنے سربسجود ہے۔ یہ کہنا کہ انسان آسمانوں کی سیر نہیں کر سکتا یا اللہ کے حضور سجدہ ریز نہیں ہو سکتا یا یہ کہنا کہ کوئی بندہ اللہ کو نہیں دیکھ سکتا اتنی بڑی جہالت اور اتنا بڑا ظلم ہے کہ جس کے سامنے کوئی بڑی جہالت اور کوئی ظلم نہیں ٹھہرتا۔ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ انسان بلا کسی فاصلے کے روشنی کے دوش پر امریکہ سے کراچی منتقل ہو جاتا ہے۔ وہ امریکہ میں بات کرتا ہے ہم ٹی وی پر اسے سنتے ہیں اور دیکھتے ہیں مگر روشنیوں کے جسم سے آسمانوں کی رفعت کو نہیں چھو سکتا۔ کوئی بندہ اگر اپنے اندر اس صلاحیت سے واقف ہو جائے جس صلاحیت نے ٹی وی ایجاد کر لیا ہے تو اس کے لئے کس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس کونے سے اس کونے پر اس عالم سے اس عالم میں اپنے ارادہ اور اختیار سے منتقل نہ ہو جائے۔

پہلے جو باتیں جادو اور طلسمات کے نام سے مشہور تھیں اور جن کو ہمارے دانشور کرامات کہتے تھے آج وہی سب چیزیں ہماری آنکھوں کے سامنے سائنسی ایجادات کی شکل میں ہیں۔

آدمی کس قدر عجیب ہے ایک طرف اتنا بے بس اور مجبور ہے کہ سو قدم کی آواز نہیں سن سکتا اور دوسری طرف اتنا آزاد ہے کہ اپنی ہی ایجادات کے ذریعے ہزاروں میل کی آواز سن لیتا ہے۔ ہزاروں میل دور ٹی وی اسکرین پر خود کو ظاہر کر دیتا ہے۔

قلیل علم

اللہ وہ ہے جو ہر چیز پر محیط ہے۔ جو کچھ ہم کرتے ہیں اللہ اسے دیکھتا ہے اور جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اللہ اسے جانتا ہے۔ اگر ہم ایک ہوں تو دوسرا اللہ ہے۔ اگر ہم دو ہوں تو تیسرا اللہ ہے۔ اللہ ہی ابتدا ہے، اللہ ہی انتہا ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر اللہ کا علم لا محدود اور لا متناہی ہے۔ اللہ کریم نے جب کائنات بنانے کا ارادہ کیا تو فرمایا ''کن'' اور کائنات وجود میں آ گئی۔ اس بات کو آسان الفاظ میں اس طرح کہا جائے گا کہ کائنات دراصل اللہ کا علم ہے جس کا مظاہرہ بھی علم کی صورت میں ہوا ہے۔ اللہ کے علم نے ہی کائنات کے خدوخال کا رنگ وروپ اختیار کیا ہے اس لئے پوری کائنات علم کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ سمندر کے پانی کا ایک قطرہ بھی بہر حال پانی ہے۔ سمندر میں سے لئے ہوئے ایک قطرہ آب کو پانی کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ پوری کائنات اللہ کے علم کا مظاہرہ ہے۔ اس لئے کائنات کی حقیقت کائنات کی بنیاد اور کائنات کی ہیئت بھی علم ہے۔ جب ہم عالم ناسوت کی قیدوبند کی زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ پوری زندگی علم ہے اور علم اس وقت علم ہے جب اس کے اندر معانی اور مفہوم ہوں۔

کائناتی نظام میں غور کرنے سے عجیب قسم کی پریشانی ہوتی ہے کہ اللہ نے یہ کیا نظام قائم کیا ہے۔

مثلاً یہ کہ کوئی آدمی کھائے پئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہر آدمی سونے پر مجبور ہے، اتنی بندشیں ہیں کہ جن کا کوئی شمار نہیں۔ علم کا یہ مفہوم اللہ کے ذہن میں جو علم ہے اس کے وقوف سے الگ ہے۔ اللہ نے آدم سے فرمایا:

''اے آدم! تو اور تیری بیوی جنت میں رہو اور خوش ہو کر کھاؤ جہاں سے دل چاہے۔''

جنت ایک ایسی بستی ہے کہ جس کی حدود کا تعین نہیں کیا جا سکتا یعنی اس کی حدود لا متناہی ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے (خوش ہو کر کھاؤ جہاں سے دل چاہے) یہ ظاہر کرتا ہے کہ آدم کو اللہ نے لا محدود جنت کے رقبے پر تصرف عطا کر دیا تھا۔ باالفاظ دیگر ہمارے باپ آدم جنت کے لا محدود رقبے کے بلا شرکت غیرے مالک تھے۔ ساتھ ہی اللہ کریم نے یہ فرمایا:

''اس درخت کے قریب مت جانا اور اگر تم نے ہمارے اس حکم پر عمل نہیں کیا تو تم اپنے اوپر ظلم کرو گے۔''

جنت لامحدود رقبہ ہے اور اس میں لاتعداد اور لاشمار درخت ہیں۔ ایک مخصوص درخت کی طرف اشارہ کرکے آدم کو ہدایت کی گئی کہ اس درخت کے قریب مت جانا۔ آدم سے نافرمانی سرزد ہوئی اور اس نافرمانی کے جرم میں جنت کی فضاؤں نے آدم کو رد کر دیا اور آدم جس سرزمین کا بلاشرکت غیرے مالک تھا وہ زمین اس سے چھین لی گئی۔

اس واقع کا نقشہ کچھ اس طرح بنتا ہے کہ ایک وسیع و عریض باغ ہے۔ باغ کے پھول، پھل، پودوں، نہروں، آبشاروں، محلات وغیرہ پر آدمی کو پورا پورا تصرف ہے۔ صرف باغ کا ایک حصہ ایسا ہے کہ تصرف تو حاصل ہے لیکن اس تصرف کے اختیار کو استعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ جب تک آدم نے نافرمانی کا ارتکاب نہیں کیا آدم کے لئے جنت کا وسیع رقبہ زمان و مکان (Space&Time) سے آزاد رہا اور جب آدم سے نافرمانی سرزد ہو گئی تو آدم کے اندر ٹائم اسپیس کی حد بندیاں منتقل ہو گئیں۔

اس درخت کے بارے میں بہت سی باتیں کی جاتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ گیہوں کا درخت تھا، کوئی کہتا ہے سیب کا درخت تھا۔ کسی مسلک کے لوگ کہتے ہیں کہ انگور کا درخت تھا۔ مختلف لوگ مختلف باتیں کہتے ہیں لیکن آسمانی کتابوں میں اس کا کوئی نام نہیں آیا۔

روحانی نقطہ نظر سے جب لاشعوری واردات و کیفیات سے اس درخت کا مشاہدہ کیا جاتا ہے تو دراصل یہ ایک طرز فکر کا سمبل (Symbol) ہے۔ ہو یہ رہا ہے کہ جو کچھ جنت میں موجود ہے وہ دروبست آدمی کے ارادے کے تابع ہے۔ آدمی کا دل چاہا کہ وہ سیب کھائے جنت میں سیب کے درخت بھی ہیں اس پر سیب بھی لگے ہوئے ہیں لیکن سیب کا توڑنا وہاں زیر بحث نہیں آتا۔ سیب کھانے کو دل چاہا سیب موجود ہو گیا۔ پانی پینے کو دل چاہا پانی موجود ہو گیا۔ اس طرز فکر سے تصرف کی دو طرزیں سامنے آتی ہیں۔ تصرف کی ایک طرز فکر یہ ہے کہ ایک بندہ سیب کا درخت لگاتا ہے اس کی نشوونما کا انتظار کرتا ہے۔ طویل عرصے کے بعد درخت اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کے اوپر پھل لگیں، اس کے اندر سیب کھانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو سیب کے درخت کی طرف چلتا ہے اور درخت پر سے سیب توڑ کر کھا لیتا ہے۔ تصرف کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سیب کے درخت پر سیب لگے ہوئے ہیں۔ اس درخت کو نہ تو کسی بندے نے زمین میں بویا ہے اور نہ اس کی نگہداشت کی ہے، نہ اس درخت کو پروان چڑھانے میں کوئی خدمت انجام دی ہے۔ اس کے اندر درخت پر سیب توڑنے کی خواہش ہوئی، دل چاہا کہ سیب کھاؤں، سیب حاضر ہو گیا۔ اس میں بہت حکمت بیان کی گئی ہے۔

اللہ کریم کے ارادے میں یہ بات موجود تھی کہ کائنات وجود میں آئے۔ اللہ نے کہا ہو جا (کن) کائنات بن گئی۔ جنت کی زندگی میں آدم کے دماغ میں یہ بات موجود تھی کہ وہ سیب کھائے۔ آدم نے کہا سیب، سیب موجود ہو گیا۔ کن کہنے سے کائنات بن گئی، سیب کہنے سے سیب مل گیا۔ اس بات کو اللہ نے ''احسن الخالقین'' کہہ کر بیان کیا ہے:

''میں تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق ہوں۔''

یعنی اللہ نے اپنے علاوہ بھی اپنی مخلوق کو تخلیق کرنے کے اختیارات سے نوازا ہے۔ انسانی تخلیق اور اللہ کی تخلیق میں حد فاضل یہ ہے کہ اللہ وسائل کے بغیر تخلیق فرماتا ہے۔ اللہ کے ذہن میں جو کچھ تھا اس کے بارے میں اللہ نے ''کن'' کہہ کر ان تمام چیزوں کو جو اللہ ظاہر

فرمانا چاہتا تھا تخلیق کر دیا۔ آدم کے اندر جو تخلیقی صلاحیتیں کام کر رہی ہیں وہ وسائل کی محتاج ہیں۔ جب کوئی بندہ ان تخلیقی صلاحیتوں کو ٹائم اسپیس کی حد بندیوں سے آزاد ہو کر استعمال کرتا ہے وہ روحانی زندگی میں رہتا ہے اور جب کوئی بندہ ان تخلیقی صلاحیتوں کو وسائل کے اندر (ٹائم اسپیس) بند ہو کر استعمال کرتا ہے مادی زندگی گزارتا ہے، محتاج اور پابند زندگی جہالت اور ظلم کی زندگی ہے۔

جس طرح دانائی عقل و شعور ایک درخت کی طرح پھلتا پھولتا ہے اس ہی طرح علم کے اندر طرح طرح کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔

نئے نئے فلسفوں کی داغ بیل پڑتی ہے۔ نئی نئی ایجادات ہوتی ہیں بالکل اس ہی طرح ظلم و جہالت کے درخت پر بھی پھول پتے اور شاخیں ہوتی ہیں لیکن چونکہ بنیاد ظلم اور جہالت ہے اس لئے آدمی ان ساری ایجادات اور ساری ترقی سے خوش ہونے کی بجائے ناخوش ہوتا ہے، پر سکون ہونے کی بجائے بے سکون ہوتا ہے، مطمئن ہونے کی بجائے غیر مطمئن زندگی گزارتا ہے۔

جب ہم موجودہ سائنسی ترقی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس ترقی میں وہ تمام چیزیں ملتی ہیں جن کو اللہ نے ظلم و جہالت کے نام سے بیان فرمایا ہے۔ آج کی ترقی پوری نوع انسانی کے لئے ایک عذاب بن گئی ہے۔ ہر شخص غیر مطمئن اور بے سکون ہے۔ دنیا کے اس کونے سے اس کونے تک عدم تحفظ کا اژدھا منہ کھولے پوری نوع انسانی کو نگلنے کے لئے بے قرار ہے۔ حالانکہ جہاں تک ترقی کا معاملہ ہے۔ یہ ساری ترقیاں یہ ساری ایجادات یہ ساری تخلیقات اس خیال کے تحت وجود میں آئیں کہ نوع انسانی کو سکون ملے گا لیکن چونکہ یہ تمام ترقیاں اور نئی نئی ایجادات ٹائم اسپیس میں بند ہو کر وجود میں آئی ہیں اس لئے آدمی بد حال اور پریشان ہے۔ ٹائم اسپیس سے آزاد روحانی انسان فطرت کی پیروی کرتا ہے اور جب ہم فطرت پر غور کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ زمین پر موجود وسائل خلوص اور اعتبار پر قائم ہیں۔ اس کے پیچھے کوئی ذاتی غرض اور صلہ کی خواہش نہیں ہے۔ سورج روز نکلتا ہے، دھوپ سے مخلوق کو فائدہ پہنچتا ہے۔

پانی مخلوق کے اندر سیرابی کا ذریعہ بنتا ہے لیکن پانی کو مخلوق سے کسی صلہ و ستائش کی غرض نہیں ہے۔ یہی حال ہوا، آکسیجن، نباتات، جمادات اور گیس کا بھی ہے۔ سائنسی ایجادات نوع انسانی کے لئے عذاب اس لئے بن گئی ہیں کیونکہ اللہ کے پیدا کردہ وسائل سے بنائی گئی اشیاء میں انسان کا پست ذہن (دولت پرستی) شامل ہو گیا ہے۔

کائناتی خدوخال

کائنات اور کائنات میں موجود تخلیقات اور تخلیقات میں تمام نوعیں اور ہر نوع میں الگ الگ افراد، پیدائش کا تسلسل اور موت کا وارد ہونا اور سماوات سورج، چاند، ستارے، کہکشانی نظام، جنت دوزخ اور دوزخ جنت کے اندر زندگی گزارنے کے حواس اور تقاضے، حواس میں ردوبدل اور ردوبدل کے ساتھ حواس میں کمی وبیشی ذہنی رفتار کا گھٹنا یا بڑھنا، حواس کا الگ الگ ہونا، سننا، دیکھنا، چھونا، چکھنا، محسوس کرنا، جسمانی نظام کا الٹ پلٹ ہونا، جذبات میں اشتعال پیدا ہونا، کسی بندے یا کسی ذی روح کا نرم خو ہونا، یہ سب چیزیں اللہ کے ذہن میں موجود علم کا عکس ہیں۔ کائنات میں موجود کوئی شئے اس کی حیثیت کسی بڑے سے بڑے سیارے کی ہو، سٹار کی ہو یا کسی چھوٹے سے چھوٹے ذرے کی ہو، ایٹم کی ہو، وائرس کی ہو، شئے کی موجودگی اللہ کریم کے ذہن میں موجود تھی۔ جب اللہ نے خوبصورت دنیا کو مظہر بنانا چاہا تو کہا:

''ہو جا''

اور تمام چیزیں وجود میں آ گئیں۔ تخلیقات کا کنبہ اتنا وسیع ہے کہ اللہ نے خود کہا ہے کہ سارے سمندر روشنائی بن جائیں اور سارے درخت قلم بن جائیں پھر بھی اللہ کی باتیں پوری نہیں ہوں گی۔ کائنات کیوں بنائی گئی اور یہ ساری تخلیقات کیوں عمل میں آئیں؟

جنت دوزخ کے دو الگ الگ گروہ کیوں بنے؟ غیب کی دنیا کے عجائبات سے ظاہر دنیا کے بے شمار عجائبات کس طرح تخلیق ہوئے؟ اس کی وجہ خود اللہ نے بیان کی ہے۔ ''میں چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ کائنات تخلیق کروں تا کہ کائنات کے افراد مجھے پہچان لیں۔'' اس حدیث قدسی میں تفکر کرنے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ کائنات کی تخلیق کا منشاء یہ ہے کہ خالق کائنات چاہتا ہے کہ اسے پہچانا جائے۔ پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ تمام مخلوقات میں سے کسی ایک مخلوق کا انتخاب کر کے دوسری مخلوقات کے مقابلے میں اسے زیادہ علم دیا جائے۔ علم کے اندر مفہوم اور معنویت تلاش کرنے کی صلاحیت بھی عطا کی جائے۔ کائناتی کنبہ میں دو مخلوقات ایسی ہیں جن کو اللہ کریم نے تلاش اور مفہوم پہچاننے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ ایک انسان اور دوسرے جنات۔ جنات کی تخلیق چونکہ اس وقت زیر بحث نہیں ہے اس لئے انسانی علوم پر ہی گفتگو کی جا رہی ہے۔ کائنات اللہ کریم کا وہ علم ہے جو اللہ کے ذہن میں موجود تھا یعنی اللہ اس بات سے واقف تھا کہ کائنات کے تخلیقی خدوخال کیا ہیں؟ اپنے علم کے مطابق اللہ نے تخلیقی خدوخال کو اپنے حکم اور ارادے سے شکل وصورت بخش دی۔ یعنی اللہ کا ذاتی اور مخصوص علم شکل وصورت بن کر وجود میں آ گیا۔

اللہ کریم نے آدم کو اپنی ''صفت اور اسماء'' کا علم عطا کیا ہے۔ اسماء سے مراد اللہ کی صفات اور کائنات کے خدوخال ہیں۔ یہ ایسا علم ہے جسے فرشتے بھی نہیں جانتے۔ جب یہ علم آدم نے سیکھ لیا تو فرشتوں کو آدم کے سامنے جھکنا پڑا۔ آدم کو اللہ کریم نے یہ بتادیا کہ کائنات میرے ذاتی علم کا ایک حصہ ہے اور اس علم میں معنیٰ اور مفہوم کے ساتھ بے شمار فارمولے ہیں جن فارمولوں سے ساری کائنات تخلیق کی گئی ہے۔ آدم کو کائناتی تخلیق کے فارمولے سکھانے کے بعد جنت میں بھیج دیا گیا۔ جنت میں آدم کی پوزیشن ایک ایسے سائنسدان کی ہے جو کائنات کے تخلیقی فارمولوں کا علم رکھتا ہے۔ ان فارمولوں میں بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ساری کائنات ایک علم ہے اور آدم اس علم میں معانی اور مفہوم کے ساتھ تصرف کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔

روشنی

اللہ کریم احسن الخالقین ہیں۔ خالقین کا لفظ ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ کے علاوہ اور بھی تخلیق کرنے والے ہیں۔ لیکن مخلوق مزید تخلیقات کے معاملے میں وسائل کی پابند اور محتاج ہے۔ اس کی مثال آج کے دور میں بجلی کی ہے۔ اللہ کی ایک تخلیق بجلی (Electricity) ہے۔ جب بندوں نے اس تخلیق سے دوسری ذیلی تخلیقات کو متحرک کرنا چاہا تو لاکھوں ہزاروں چیزیں وجود میں آ گئیں۔ آدم زاد نے جب بجلی کے علم کے اندر تفکر کیا تو اس بجلی سے لاشمار چیزیں وجود میں آ گئیں۔ بجلی سے بنی ہوئی یا بجلی سے چلنے والی مشینوں سے جتنی چیزیں وجود میں آئیں وہ انسان کی تخلیق ہیں مثلاً ریڈیو، ٹی وی اور دوسری بے شمار چیزیں۔ اللہ کریم کی اس تخلیق (Electricity) بجلی سے جو دوسری ذیلی تخلیقات کا مظہر بنا **ابن آدم کا بجلی کے اندر تصرف ہے۔ یہ وہی علم ہے جو اللہ نے آدم کو سکھا دیا ہے۔**

اسماء سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے آدم کو ایک ایسا علم سکھا دیا کہ جو تخلیقی فارمولوں سے مرکب ہے۔ کوئی انسان جب اس علم کو حاصل کر لیتا ہے تو نئی نئی چیزیں بن جاتی ہیں۔ وسائل کی حدود سے گزر کر یا وسائل کے علوم سے آگے بڑھ کر جب کوئی بندہ روشنیوں کے علم سے دھات (لوہے) میں تصرف کرتا ہے تو بڑی بڑی مشین کل پرزے، جہاز، ریل گاڑیاں، خطرناک اور بڑے بڑے بم بن جاتے ہیں۔ تصوف میں اس عمل کو "ماہیت قلب" کہا جاتا ہے۔ وسائل میں محدود رہ کر مٹی کے مخصوص ذرات کو کٹھالی میں پکا کر سونے بناتے ہیں۔ مٹی کے ذرات کو مخصوص پروسیس سے گزار کر ہم لوہا بناتے ہیں۔ لیکن وہ بندہ جو روشنیوں میں تصرف کرنے کا اختیار رکھتا ہے، ذخیرے میں سے ان مقداروں کو الگ کر لیتا ہے جو مقداریں سونا بناتی ہیں تو سونا بن جاتا ہے۔ تصرف کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ وسائل میں محدود رہ کر وسائل کو مجتمع کر کے کوئی چیز بنائی جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ روشنیوں میں تصرف کر کے روشنیوں کو متحرک کر دیا جائے۔ علم روحانی کی تھیوری پڑھ کر پریکٹیکل میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کائنات میں موجود ہر شئے کی بنیاد اور بساط (Base) روشنی ہے اور روشنی معین مقداروں کے ساتھ ردوبدل ہوتی رہتی ہے اور معین مقداروں کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ پیدائش سے موت تک کا زمانہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کوئی بچہ اپنی ایک حیثیت پر قائم نہیں رہتا۔ جن معین مقداروں پر بچہ پیدا ہوا ہے، ان معین مقداروں میں ایک ضابطہ ایک قانون اور ترتیب کے ساتھ ردوبدل ہوتا ہے۔ جس طرح مقداروں میں ردوبدل ہوتا ہے اسی مناسبت سے بچہ بھی بدلتا رہتا ہے۔ آدمی کا بچہ جوان یا بوڑھا ہو، بہر صورت آدم رہتا ہے۔ اس کی شکل وصورت اور خدوخال میں تو تبدیلی ہوتی رہتی ہے لیکن شکل وصورت برقرار رہتی ہے۔ اللہ نے کائنات کو مختلف نوعوں میں تقسیم کیا ہے۔ معین مقدار یہ ہے کہ آدم ہر حال میں آدم رہتا ہے، بندر کا بچہ ہر صورت میں

بندر کا بچہ رہتا ہے لیکن عمر کے ساتھ ساتھ اس کے اندر زندگی گزارنے کے تقاضوں میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ تبدیلی یہ ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کے نقوش جوانی میں سرتاپیر بدل جاتے ہیں۔ جوانی کے بعد بڑھاپا آتا ہے تو بڑھاپے میں جوانی کے نقوش ڈھل جاتے ہیں۔ اور اس طرح ڈھل جاتے ہیں کہ جوانی کی تصویر اور بڑھاپے کی تصویر دو الگ الگ تصویریں نظر آتی ہیں۔ قائم بالذات معین مقداریں یہ ہیں کہ آدمی ایک دن کا بچہ ہو یا سو سال کا بوڑھا ہو، بھوک پیاس کا تقاضہ اس کے اندر موجود رہتا ہے۔

عجیب رمز یہ ہے کہ دو سال کا بچہ بھی پانی پیتا ہے۔ دو سال کا بچہ غذا کھاتا ہے۔ سو سال کا بوڑھا آدمی بھی پانی پیتا ہے، سو سال کا بوڑھا بھی روٹی کھاتا ہے لیکن سو سال کا بوڑھا دو سال کا بچہ نہیں ہوتا اور دو سال کا بچہ سو سال کا بوڑھا نہیں ہوتا۔ روحانی علوم ہمارے اوپر یہ بات واضح کرتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ تقاضے بڑھاپے اور بچپن کے یکساں ہیں شکل و صورت اور خدوخال کیوں تبدیل ہو جاتے ہیں؟ شکل و صورت اور خدوخال کے ردوبدل میں کون سے علوم کام کر رہے ہیں؟ ان علوم سے روشناس ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان روشنیوں کا علم حاصل کریں جن روشنیوں کو اللہ کریم نے اپنی صفات کہا ہے۔

ذات وصفات

صفات سے کسی چیز کاادراک توکیاجاسکتاہے لیکن ذات کی حقیقت اور کنہہ تک نہیں پہنچاجاسکتا۔عام زندگی میں اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کانام ''الف'' ہے۔الف کی صفات یہ ہیں کہ وہ بہت نرم دل ہے، بہت سخی ہے، رحم کرنے والا ہے، دوسروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتا ہے۔اس کے برعکس دوسرا شخص ''ب'' ہے۔اس کے اندر سختی ہے، شقاوت ہے، وہ خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہے، مہربان ہونے کی بجائے لوگوں کو پریشان کرتا ہے، لوگوں کے دکھ درد اور مصائب میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔''الف'' کی صفات زیر بحث آئیں یا ''ب'' کی عادات و خصائل سامنے آئیں ان سے ''الف'' اور ''ب'' کے تشخص کی نشاندہی تو ہوتی ہے لیکن فی الواقع ''الف'' کیا ہے اور ''ب'' کیا ہے؟ اس کے بارے میں ہم کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ہو سکتا ہے کہ آج کا وہ ''الف'' جو نرم خو اور نرم دل ہے کل سخت گیر ہو جائے یہ بھی ممکن ہے کہ آج کا ''ب'' اپنی عادات وخصائل کے اعتبار سے جو کچھ ہے کل اس کے اندر تبدیلی واقع ہو جائے اور وہ لوگوں کو پریشان کرنے کی بجائے لوگوں کے دکھ درد کو دور کرنے میں مثالی کردار ادا کرے۔عادات وخصائل اور صفات کو سامنے رکھ کر کسی فرد کی شخصیت کا ایک ہیولیٰ تو قائم کیا جاسکتا ہے لیکن فی الواقع وہ اپنی صفات کے اعتبار سے کیا ہے اس کے بارے میں یقینی بات نہیں کی جاسکتی۔اس لئے کہ صفات میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے لیکن ذات میں ردوبدل نہیں ہوتا۔آج ''الف'' اگر نرم دل ہے اور آنے والے کل میں وہ سخت گیر ہو جائے تو یہ دراصل اس کی صفات میں تبدیلی ہے لیکن ''الف'' جب نرم دل تھا تو تب بھی ''الف'' تھا اور جب وہ سخت گیر ہوا تب بھی ''الف'' تھا۔

قانون:

جاننے اور پہچاننے کی طرزیں متعین ہیں۔ایک یہ کہ کسی شئے کو اس کی صفات سے پہچانا جاتا ہے اور دوسری طرز یہ ہے کہ کسی شئے کو اس کی ذات سے پہچانا جائے۔

مثال:

ہمارے سامنے لوہے کا ایک ٹکڑا ہے جب ہم لوہے کی صفات کا تذکرہ کرتے ہیں تو دراصل ہمارے سامنے لوہے کی صفات سے مرکب بہت سی اشیاء آجاتی ہیں۔لوہے سے ایک چھری بھی بنتی ہے اور لوہے سے وہ پٹڑی بھی بنتی ہے جس پر ریل چلتی ہے۔لوہے کی صفات کا ایک عکس چھری بھی اپنے اوصاف پر قائم ہے۔اس چھری سے پھل کی قاشیں بنتی ہیں یہ چھری دوسرے مفید اور تعمیری کاموں میں بھی کام آتی ہے اور اس چھری سے کسی کا پیٹ بھی چیرا جاسکتا ہے۔پانی کا ایک وصف یہ ہے کہ وہ پیاس بجھاتا ہے اور پانی کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے بجلی جیسی انرجی وجود میں آرہی ہے۔پانی کے ذریعے بجلی حاصل کرنا دراصل پانی کا ایک وصف ہے لیکن ابھی ہمارے اوپر یہ بات منکشف نہیں ہوئی کہ فی الواقع

پانی کیا چیز ہے؟ سائنس دان جن اجزاء کو پانی کا مرکب تسلیم کرتے ہیں یا جن اجزاء سے پانی بنتا ہے ان اجزاء کو اکٹھا کرنے کے بعد پانی تو بن جاتا ہے لیکن بہر حال اسے قدرتی پانی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کسی چیز کا وصف تلاش کر لینا تو انسانی علوم اور انسانی عقل و شعور میں آسکتا ہے لیکن کنہ معلوم کر لینا انسانی شعور اور لاشعور کی سکت سے باہر ہے۔ پانی فی الواقع کیا ہے، کن حقیقی اجزائے ترکیبی سے مرکب ہے؟ اس بات کا انکشاف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نائب اور حضور ﷺ کے روحانی وارث ہیں۔

ہم کوئی چیز ایجاد کرتے ہیں تو اربوں کھربوں روپیہ خرچ کر ڈالتے ہیں۔ فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ ایجادات میں تعمیر و ترقی توازن سے ہم آہنگ نہیں ہوتی۔ موجودہ دور میں سائنس کی محیر العقول نئی نئی ایجادات نے عجیب فسوں کاری کی ہے۔ کہنے میں یہی آتا ہے کہ سائنس ترقی کی طرف گامزن ہے انسان نے علم میں کمال حاصل کر لیا ہے، ٹائم اسپیس کی حد بندیوں کو جو صدیوں سے رائج تھیں توڑ دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو ایجادات ہمارے سامنے آئیں ہیں ان اشیاء سے تعلق رکھتی ہیں جو اشیاء پہلے سے زمین پر موجود ہیں۔ ان ایجادات کا پورا فائدہ ہمیں اس لئے نہیں پہنچا کہ ہمارا علم محدود ہے۔ صفات کے بعد شئے کی اہمیت اور شئے کی کنہ کیا ہے؟ اس طرف ہم نے کوئی توجہ نہیں دی۔ کوئی روحانی انسان محض صفات کی بھول بھلیوں میں گرفتار نہیں ہوتا وہ صفات کو روشنی یا میڈیم بنا کر ہمیشہ اس ذات کا متلاشی رہتا ہے جس ذات مطلق میں طاقت کے ذخیرے موجود ہیں۔ ماورائی اسباق میں یہ بات بہت زیادہ توجہ کے ساتھ شاگردوں کو بتائی جاتی ہے کہ صفات دراصل کسی ذات کا عکس ہوتی ہے اور عکس ماضی ہوتا ہے۔

آسمانی کتابوں میں جہاں جہاں صفات کا تذکرہ آیا ہے وہاں وہاں اللہ نے صفات کو اپنی نشانیاں قرار دیا ہے تاکہ ان نشانیوں میں غور و فکر کرے اور ذہن گہرائی میں استعمال کر کے ذات کا کھوج لگایا جائے۔ صفات کو تلاش کرنے کی بہت ساری راہیں مختلف اوقات میں متعین کی گئی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان راہوں کو مذہبی معاونت (Support) حاصل ہے لیکن کسی مذہبی کتاب میں یہ بات نہیں کہی گئی کہ مقصود و منتہا صفات کا حصول ہے۔

ان متعین راہوں میں سب سے پہلی اور بنیادی بات ارتکاز توجہ ہے یعنی جو علم آدمی حاصل کرنا چاہتا ہے اس علم کے حصول کے لئے دوسرے علوم سے قطع نظر ایک نقطہ متعین کر کے اس نقطے میں تفکر کیا جائے اور اس نقطے کے اندر فہم و ادراک کی ساری صلاحیتیں مرکوز کر دی جائیں۔ ارتکاز توجہ کے لئے بہت سے طریقے ایجاد ہوئے۔ ان طریقوں میں یوگا، سانس کی مشقیں، پاس انفاس، ہپناٹزم، مسمریزم، ٹیلی پیتھی، لمس، مراقبہ وغیرہ شامل ہیں۔ ہم جب ان مشقوں کی افادیت پر غور کرتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آدمی صفات سے ہٹ کر ذہن کے اندر (Inner) میں ایسی تصویر کشی کرنا چاہتا ہے یا اپنے اندر اس ادراک کو حرکت دینا چاہتا ہے جو ادراک صفات سے ہٹ کر ذات کا مشاہدہ کرتا ہے۔

قوتِ متخیلہ (۱)

آدم جب سے زمین پر آباد ہے اس علم سے واقف ہوتا رہا کہ زمین کے اندر ایسی مخفی طاقتیں موجود ہیں جن سے زندگی کے لئے وسائل فراہم ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زمین کے اندر کوئی بیج ڈالا جاتا ہے تو بیج کی اپنی مخفی طاقت اور زمین کے اندر اپنی مخفی طاقت مل کر ایک دوسرے سے ضرب ہوتی ہے اور نتیجہ میں تیسری چیز کا وجودی پیکر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ سائنسی نقطہ نظر سے اس بات کو اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ بیج کے اندر مخفی قوت یا انرجی زمین کی مخفی قوت یا انرجی سے مل کر جب اپنا مظاہرہ کرتی ہے تو نتیجے میں کوئی پودا نمودار ہوتا ہے اور پھر وہ پودا بڑھ کر تناور درخت بن جاتا ہے اور اس درخت میں پھل اور پھول لگتے ہیں لیکن بیج کے اندر مخفی طاقت کی کنہ کیا ہے اور زمین کے اندر مخفی طاقت کی کنہ کیا ہے۔ یہ بات ابھی تک سائنس دانوں کے سامنے نہیں آئی۔

اگر اس اہم مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو آسان الفاظ میں یوں کہا جائے گا کہ بیج ایک تشخص ہے اور بیج کے اندر اس کی صفات وہ درخت ہے جو بیج کی نشوونما پانے کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ بیج کا دوسرا وصف یہ ہے کہ بیج اپنی صفت کا مظاہرہ کرتا ہے یعنی پھول بنتا ہے تو اس کے اندر بھی بیج ہوتے ہیں۔ بیج اپنی صفات کا مظاہرہ کرتا ہے اور صفت کو پتوں کے روپ میں ظاہر کرتا ہے۔ ہمارے پاس کوئی طریقہ ایسا موجود نہیں کہ تمام پتوں کو شمار کر سکیں انسانی عقل اتنی محدود ہے کہ وہ ایک بیج کے پھیلاؤ کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ روحانی انسان جب بیج کا تجزیہ کرتا ہے اور انر میں موجود روشنی سے بیج کے اندر تفکر کرتا ہے تو کہتا ہے کہ بیج ایک صفاتی مظہر ہے۔ ہم جب عقل و شعور کے اعتبار سے چھوٹے سے بیج کی صفات کا احاطہ نہیں کر سکتے تو ہمیں بالآخر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اللہ کی صفات کو سمجھنا محدود عقل و شعور سے ماوراء ہے کیونکہ کسی چیز کی کنہ کو سمجھنے کے لئے عقل و شعور بے بس ہے۔ اس لئے ہمیں ایسے طریقے اختیار کرنا پڑیں گے جو طریقے ہمیں عقل و شعر سے باہر کی دنیا میں لے جائیں اور عقل و شعور سے باہر کی دنیا سے ہمیں روشناس کرائیں۔

ارتکاز توجہ یا مراقبہ ان طریقوں میں سے پہلا طریقہ ہے۔ زیادہ پڑھے لکھے لوگ سائنسی نظریات کی بھول بھلیوں میں گم افراد عقل و شعور سے آراستہ دانشور جب روحانی علوم کے اندر غور کرتے ہیں (کیونکہ ان علوم کو وہ عقل و شعور کے دائرے میں بند کرنا چاہتے ہیں بالفاظ دیگر لا متناہی علم کو تنہایت میں قید کرنا چاہتے ہیں) اور ان کے سامنے جب کوئی حل نہیں آتا تو وہ روحانیت کو قوت متخیلہ کہہ دیتے ہیں۔ روحانیت کو قوت متخیلہ کہہ کر گزر جانے کے بعد تحقیق، تلاش کے دروازے اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں۔

جہاں تک قوت متخیلہ کا تعلق ہے خیال کی قوت سے کسی چیز کو باہر نہیں کہا جاسکتا۔ زندگی کے سارے اعمال واشغال قوت متخیلہ کے اوپر قائم ہیں۔ دانشور یہ تو کہتے ہیں کہ روحانیت قوت متخیلہ کا مرکب ہے لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ قوت متخیلہ کیا ہے؟ جتنی کچھ ترقیاں سامنے آچکی

ہیں اور جتنی کچھ ترقیاں ہمارے سامنے آئیں گی ان سب میں ایک ربط قائم کیا جائے تو ایک ہی بات کہی جائے گی کہ یہ سب قوت متخیلہ ہے۔ سائنسدان کے دماغ میں یہ خیال وارد ہوا کہ ایسا ہتھیار ایجاد کرنا چاہئے کہ جس سے بیک وقت لاکھوں جانیں موت کے گھاٹ اتر جائیں۔

دوسرے سائنسدان کے دماغ میں یہ خیال وارد ہوا کہ کوئی ایسا آلہ ایجاد کرلے جو آوازوں کو پکڑلے۔ تیسرے سائنسدان کے ذہن میں یہ خیال وارد ہوا کہ ایسی اسکرین بنانی چاہئے۔ جس اسکرین پر دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے پر تصویر منعکس ہو جائے۔ یہ سب ایجادات کسی ایک بندے کے ذہن سے شروع ہوئی۔ اس خیال پر ذہنی استعداد کو مسلسل اور متواتر مرکوز کیا گیا تو نئی نئی ایجادات وجود میں آتی رہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر سائنسدان کی تحقیق و تلاش کے نتیجے میں کوئی ایک ایجاد اس ایک سائنسدان تک محدود رہ جاتی اور دوسرے بے شمار سائنسدان اپنی خیالی قوت کو اس ایجاد پر استعمال نہ کرتے تو ایجاد کس طرح وجود میں آتی؟

یہ کہنا کہ روحانیت قوت متخیلہ ہے بڑی جہالت اور کم عقلی ہے۔ روحانیت میں خیال ایسی اطلاع کو کہا جاتا ہے جو اطلاع مسلسل اور متواتر کسی ایک نقطے پر مرکوز ہو جائے۔ جب کوئی اطلاع یا خیال کسی ایک نقطہ پر مرکوز ہو جائے تو بالآخر وہ چیز جو خیال میں موجود ہے مظہر بن جاتی ہے اور یہ مظہر اپنی صفات کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ روحانی انسان جب برگد کے درخت کا تذکرہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ بیج نے اپنی صفات کے مظاہرے کے لئے اپنے خیال کو ایک نقطے پر مرکوز کردیا اور بیج کا خیال جب ایک نقطے پر مرکوز ہو گیا تو اس کی صفات کا مظاہرہ شروع ہو گیا اور یہ مظاہرہ ایک بہت بڑے درخت کی شکل میں زمین کے اوپر نمودار ہو گیا۔

قانون:

صفات دراصل آدمی کے اندر اطلاعات کا ایک ذخیرہ ہے۔ ان اطلاعات میں سے چند ایک یا پوری اطلاعات کو جب انسان اپنے خیال کی طاقت سے ایک نقطہ پر مرکوز کر دیتا ہے تو خیال کے اندر لامتناہی اطلاعات میں ابال آجاتا ہے اور آنکھوں کے سامنے مظاہر آنے لگتے ہیں۔ اس ہی بات کو روحانی استاد خیالات کو ایک نقطے پر مرکوز ہونا کہتے ہیں اور انر کا کھوج لگانے والے دانشور مراقبہ کہتے ہیں۔

قوتِ متخیلہ (۲)

انسان کا وجود اس کی روح کے تابع ہے۔یعنی گوشت پوست کا جسم اصل انسان نہیں ہے۔ہر ذی فہم انسان جو پاگل نہیں ہے اس کے اندر طبعی اور جبلی خواہشات ہوتی ہیں۔ہمارے معاشرے میں جو معاشرتی قدریں رائج ہیں یا جن معاشرتی اقدار میں ہم زندگی گزار رہے ہیں اس کی بنیاد بھی جبلت پر قائم ہے۔

مثال:

اگر کسی باشعور آدمی کو اس بات کا علم نہ ہو کہ اس کی ماں کون ہے، اس کا باپ کون ہے تو اس کی زندگی میں ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ لاعلمی اور محرومی بار بار اس کے ذہن میں گردش کرتی ہے۔بظاہر اس بات سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ اس کا باپ اس کی ماں کون ہے۔ اس لئے کہ ماں باپ کے مرنے کے بعد بھی وہ زندہ رہتا ہے اور خوش رہتا ہے۔اس کے باوجود کہ وہ ماں باپ کے بغیر بھی اپنی تمام دنیاوی دلچسپیاں پوری کرتا ہے۔اس کے دوست احباب ہوتے ہیں۔

اگر اسے والدین کے بارے میں معلومات نہ ہوں تو اس کی زندگی میں محرومی سنبل بن جاتی ہے۔ایسے بچے جنہیں اپنے ماں باپ کا علم نہیں ہوتا ان کو اپنی اصل سے رشتہ قائم کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے۔اس کی مثال مغربی ممالک میں وہ اولادیں ہیں جنہیں ماں باپ کا پتہ نہیں ہوتا۔ایسی نسل بادشاہ کی اولاد کہلاتی ہے۔حالانکہ یہ کہنا کہ وہ بادشاہ کی اولاد ہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ان کو اپنے ماں باپ کا علم نہیں ہے لیکن اس کے لئے یہ وجہ بھی تسکین کا سبب بن جاتی ہے کہ وہ بادشاہ کی اولاد ہیں۔معاشرے کے اس بندھن کو نوع انسانی کی تمام تہذیبیں قبول کرتی ہیں اور اس بندھن کی حفاظت کے لئے قوانین نافذ کرتی ہیں۔اس بندھن کو قائم رکھنے کے لئے ہی ذات برادری وجود میں آئی ہے۔ قانون قدرت بھی اس بندھن کی حفاظت کرتا ہے اور نوع انسانی کو اپنی اصل یعنی والدین کی خدمت اور ان کی ''عزت و احترام'' کا حکم دیتا ہے۔

سیدھی سی بات ہے کہ بے اصل آدمی کا معاشرہ میں کوئی مقام نہیں ہے۔یتیم و یسیر ہونا اور بات ہے اور بے اصل ہونا اور بات ہے۔ کوئی روحانی انسان جب اپنی اصلیت کو تلاش کرتا ہے چونکہ اس کی فکر میں وسعت ہوتی ہے اس کی ہمت میں علو ہوتا ہے اور اس کی سوچ بلند ہوتی ہے۔اس لئے وہ اپنی اصلیت کو تلاش کرتے ہوئے کائنات کی اصل تک۔۔۔۔۔۔ پہنچ جاتا ہے۔اصل کو تلاش کرنا روحانیت کا پہلا سبق یا پہلی کلاس ہے۔روحانی شاگرد پہلے خود کو تلاش کرتا ہے اور اسے خود کا سراغ مل جاتا ہے۔پھر وہ جس ماحول اور جس فضا میں زندہ ہے

اس فضااور اس ماحول کی اصلیت تلاش کرتا ہے۔ فضااور ماحول کی اصلیت میں جب اسے بے شمار گیسیں، لاتعداد روشنیاں نظر آتی ہیں تو وہ ان روشنیوں کی اصلیت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ روشنیوں کی اصلیت کی طرف متوجہ ہونے کے بعد اس کے اوپر سے غیب کے پردے اٹھنے لگتے ہیں اور غیب میں وہ اس مخلوق کا مشاہدہ کرتا ہے جو روشنی سے تخلیق ہوئی ہے۔ روشنی سے بنی ہوئی مخلوق کا مشاہدہ کرنے کے بعد وہ ان روشنیوں سے بنی ہوئی مخلوق کی اصلیت کا سراغ لگانا چاہتا ہے تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ روشنیوں کی اصل ایک ایسی روشنی ہے جو روشنی نہیں ہے۔ لیکن اظہار بیان میں محدودیت کی بنیاد پر اس کو روشنی کہہ کر بیان کرنا مجبوری ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ بجلی کی شکل کا تعین نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی نے نہیں بتایا کہ بجلی اس شکل کی ہوتی ہے۔ حالانکہ بجلی موجود ہے۔ بجلی کا عمل دخل ہمارے سامنے ہے۔ بجلی کی طاقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اور بجلی جب اپنا مظاہرہ کرتی ہے تو اس مظاہرے میں بجلی کا انعکاس بھی ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں لیکن بجلی کو لہروں کا نام تو دیا جا سکتا ہے۔ شکل بیان نہیں کی جا سکتی اور اگر بجلی کی لہروں کو کسی اسکرین پر منتقل کر لیا جائے اور اس منتقلی میں بجلی کے کچھ رنگ سفید، ہرے، نیلے، بنفشی، زرد نظر آئیں تو اس کو بجلی کا رنگ اس لئے نہیں کہا جائے گا کہ بجلی کا کسی اسکرین پر مظاہرہ ہوا ہے۔ اسکرین پر مظاہرہ میں اسکرین بھی زیر بحث آ جاتی ہے۔

اس جملہ معترضہ کے بعد ہم پھر اپنے اصل بیان کی طرف لوٹتے ہیں۔ روشنیوں کی اصل روحانی شاگرد پر ایسے دروازے کھولتی ہے کہ وہ پکار اٹھتا ہے کہ روشنی ہی اصل نور ہے۔ اور جب نور سے واقف ہو جاتا ہے تو اس کے اندر نور کی اصل کو تلاش کرتا ہے اور جب اس کے بعد اوپر نور کے دروازے کھل جاتے ہیں تو وہ پکار اٹھتا ہے کہ نور اللہ کریم کی صفات ہیں۔ صفات کا تعارف ہونے کے بعد جستجو اور تلاش کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ذہن تفکر کرنے لگتا ہے کہ جس ذات کی یہ صفات ہیں اس کو دیکھنا چاہئے۔ اللہ اگر اپنا فضل فرمائے اور سیدنا حضور ﷺ کی ''ہمت'' نصیب ہو جائے تو بندہ اس سراغ کو پا لیتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ صفات کی اصل اللہ کی مشیت ہے۔ مشیت میں انہماک اسے اور زیادہ بے قرار کر دیتا ہے۔ تلاش و جستجو، دعائیں، گداز اور حضور ﷺ کا عشق اس کے اوپر یہ بات منکشف کر دیتا ہے کہ مشیت کی اصل تجلی ہے۔ یہاں بھی اسے قرار نصیب نہیں ہوتا تو اس کے ادراک میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ مشیت کی اصل تجلی اور تجلی کی اصل تدلی ہے۔ اب وہ شعور و حواس کی نفی کر کے اللہ کی محبت کے سہارے اور آگے بڑھتا ہے اور آگے بڑھتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ بندہ ذات مطلق کا عارف بن جاتا ہے۔ یہ سب بیان کرنے سے منشاء یہ ہے کہ کسی چیز کی انتہا تک پہنچنے کے لئے ابتدا ضروری ہے اور ابتدائی دور میں داخل ہونے کے لئے اس چیز کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔ متوجہ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز کی طرف بندہ متوجہ ہوا ہے اس چیز سے متعلق اس کے اندر دلچسپی انہماک اور ارتکاز توجہ ہو۔

ارتکاز توجہ کے لئے آسان ترین طریقہ ''مراقبہ'' ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مراقبہ ایک ایسا عمل ہے جو قوت متخیلہ کو متحرک کر دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قوت متخیلہ تو بہت سارے حضرات میں متحرک ہو جاتی ہے اور وہ خیال کی اس طاقت سے بڑے بڑے کارنامے بھی انجام دیتے ہیں لیکن نوع انسانی میں ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں ہے کہ علوم ظاہری میں یا دنیاوی فارمولوں کے مطابق قوت متخیلہ کو حرکت

دینے کے بعد کسی نے فرشتہ دیکھا ہو۔ خود اپنی روح کو دیکھا ہو۔ اگر کسی کے سامنے اس کی روح آجائے جس کی شکل بھی اس جیسی ہے تو اس کے اوپر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ ''قوت متخیلہ'' بھی عجیب معمہ ہے۔

بات یہ ہے کہ جس آدمی میں اپنی اصلیت کو پہچاننے کی سکت نہیں ہوتی یا وہ اس پر شور دریا میں اترنا نہیں چاہتا وہ آرام سے کہہ دیتا ہے کہ یہ سب ''قوت متخیلہ'' ہے یعنی چیزیں حادثاتی طور پر یا اتفاقی طور پر سامنے آجاتی ہیں۔ بڑے بڑے سائنس دان اس دنیا میں گزرے ہیں اس سے پہلے ان سے بھی بڑے سائنس دانوں کے کرشمے تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہیں۔ جو آج تک سمجھ میں نہیں آتے۔

اہرام مصر ہمارے سامنے ہے۔ آج کا سائنس دان جس کا دعویٰ ہے کہ اس نے خلا میں کمند پھینک دی ہے۔ چاند کو مسخر کر لیا ہے۔ اسپیس کو توڑ دیا ہے۔ وہ اہرام مصر کے معاملے کو ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔ مقنع ایک سائنس دان گزرا ہے جس نے چاند بنا لیا تھا جو اپنے وقت پر طلوع ہوتا تھا اور زمین پر اپنی کرنیں بکھیر کر غروب ہو جاتا تھا۔ مہابھارت کی لڑائی میں ایسے ہتھیار استعمال ہو چکے ہیں جو آگ اگلتے تھے اور ''چکرورت'' زمین پر گرتا تھا۔ زمین جل کر تانبہ بن جاتی تھی۔ ظاہر ہے یہ سب ایجادات بھی اس وقت عمل میں آئیں جب ان کو بنانے کا خیال دماغ میں وارد ہوا اور ان خیالوں کی پذیرائی کی گئی۔

خبر متواتر

علم یہ ہے کہ آدمی کے اندر جاننے یا کسی چیز سے واقف ہونے کا عمل جاری ہو جائے۔ جب تک ہمیں کسی چیز کے بارے میں علم حاصل نہیں ہو جاتا اس وقت تک وہ چیز ہمارے لئے معدوم کی حیثیت رکھتی ہے۔

جاننے کی تین طرزیں ہیں۔ ایک جاننا یہ ہے کہ ہمیں کسی چیز کی اطلاع فراہم کی جائے اور ہم اس اطلاع کو یقین کے درجے میں قبول کر لیں۔

علم کی دوسری طرز یہ ہے کہ ہم کسی چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

اور علم کی تیسری قسم یہ ہے کہ ہم دیکھی ہوئی چیز کے اندر صفات کو محسوس کریں اور اس کے باطن کا مشاہدہ کر لیں۔

روحانی لوگوں نے علم کو تین درجوں میں بیان کیا ہے اور ان درجوں کے الگ الگ نام رکھے ہیں۔

1) علم الیقین

2) عین الیقین

3) حق الیقین

علم الیقین یہ ہے کہ ہمیں اس بات کی اطلاع ملی کہ سائنسدان نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جو ایک منٹ میں لاکھوں جانیں ہلاک کر دیتا ہے۔ حالانکہ ہم نے ایٹم بم کو نہیں دیکھا لیکن اس بات کا ہمیں یقین ہے کہ ایٹم بم موجود ہے۔ عین الیقین یہ ہے کہ ہمیں اطلاع ملی کہ ایک بکس ایجاد ہوا جو ہزاروں میل کے فاصلے کو منقطع کر کے اس بکس کے اسکرین پر تصویریں ڈسپلے کر دیتا ہے۔ چونکہ ہم ہزاروں میل سے چلی ہوئی تصویر کو ٹی وی اسکرین پر منعکس دیکھ لیتے ہیں اس لئے اس علم کا نام عین الیقین قرار پایا۔ عین الیقین سے مراد ہے کہ آنکھ نے اس علم کا مشاہدہ کر لیا۔ ہمیں یہ اطلاع فراہم کی گئی کہ کائنات کی بنیاد اور کائنات کی بساط میں جو کچھ موجود ہے وہ روشنی ہے۔ چونکہ روشنیاں ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں ہیں اور نہ ہی ان روشنیوں کی ماہیت سے ہم واقف ہیں اس لئے ہم کہیں گے کہ ہمیں حق الیقین حاصل نہیں ہے۔ اگر ہم روشنی کی ماہیت اور روشنی کے سورس سے واقف ہیں اور روشنی کی حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ یہ حالت حق الیقین ہے۔

سائنسدان کہتے ہیں کہ ہر چیز جو زمین کے اوپر موجود ہے۔ روشنیوں کے ہالے میں بند ہے اس ہالے کی روشنیوں کو کسی حد تک دیکھ بھی لیا گیا ہے۔ دیکھنے کی کوئی بھی طرز ہو، کیمرے میں ہو یا کسی اور ذریعہ سے ہو۔ بہر حال یہ علم حاصل ہو گیا کہ ہر چیز کے اوپر روشنیوں کا

ہالہ موجود ہے۔ لیکن ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ جس طرح روشنیوں کا ہالہ گوشت پوست کے جسم کو فیڈ کرتا ہے اس ہالے کی فیڈنگ کہاں سے ہو رہی ہے چونکہ اس فیڈنگ کے بارے میں ہماری معلومات صفر کے برابر ہیں،اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے حقیقت کو جان لیا ہے۔ روحانی شاگرد مسلسل اور متواتر مراقبہ کے بعد اپنے اندر اتنی سکت پیدا کر لیتا ہے کہ وہ علم الیقین اور عین الیقین کی حدود سے گزر کر حق الیقین میں داخل ہو جاتا ہے۔ روحانی استاد جب کسی علم کا تذکرہ کرتا ہے یا کائنات میں موجود کسی شئے کا تجزیہ کرتا ہے تو اس کے سامنے علم کے تین درجے ہوتے ہیں۔ وہ پہلے کسی شئے کو علمی حیثیت میں دیکھتا ہے، پرکھتا ہے، سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے پھر گہرائی میں جا کر اس چیز کا آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے اور مزید تفکر کے بعد وہ اس چیز کی ماہیت کو تلاش کرتا ہے اور اس کے بعد اس وقت تک اسے قرار نصیب نہیں ہوتا۔ جب تک وہ شئے کی ماہیت سے واقف نہیں ہو جاتا ان درجہ بندیوں میں اور علم کی ان گہرائیوں میں غوطے لگانے کے لئے بہرحال یہ ضروری ہے کہ کوئی بندہ پہلے صرف اطلاعات کے دائرے میں قدم رکھے یعنی کسی چیز کو صرف علم کی حیثیت سے قبول کرے۔

آسمانی کتابوں میں اس بات کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے کہ شئے کا وجود دراصل ایک (Information) ہے۔ آدم کی حیثیت علم الاسماء سیکھنے سے پہلے ناقابل تذکرہ تھی۔ آدم کو اللہ کریم نے پہلے علم عطا کیا اور اس کے بعد آدم سے کہا:

‘‘بیان کرو’’

اور فرشتوں سے بھی کہا کہ تم بھی بیان کرو۔

فرشتوں نے عرض کیا کہ ہم اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ نے ہمیں بتا دیا اس سے زیادہ ہم نہیں جانتے۔ فرشتوں کی اس گفتگو سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آدمی ہو یا فرشتہ وہ دراصل علم کی ایک مجموعی شکل ہے جس حد تک اسے علم حاصل ہے۔ فرشتے پہلے سے موجود تھے۔ آدم کی تخلیق بعد میں ہوئی۔ فرشتوں کا علم انہیں بتا رہا ہے کہ آدم زمین پر خون خرابہ اور فساد کا باعث بنے گا۔ اللہ کریم نے فرشتوں کی اس بات کو رد بھی نہیں کیا اور یہ نہیں کہا کہ آدم زمین پر فساد نہیں کرے گا بلکہ یہ کہ جو ہم جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے۔

اس بات کا فرشتوں نے بھی اعتراف کیا کہ ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا اللہ نے ہمیں سکھا دیا ہے۔ یہ بات بھی حکیمانہ ہے کہ اللہ کریم خود کہتا ہے کہ میں نے پہلے آدم کو اسماء کا علم سکھایا پھر کہا بیان کر۔

اس وضاحت کے بعد یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان کی ساری زندگی وہ خارجی ہو یا داخلی ہو زمین کے اوپر کی زندگی ہو یا زمین پر آنے سے پہلے برزخ کی زندگی ہو یا زمین سے اٹھنے کے بعد اعراف کی زندگی ہو۔ اعراف سے اٹھنے کے بعد حشر و نشر کی زندگی ہو۔ حشر و نشر کے بعد یوم الحساب کی زندگی ہو یا یوم الحساب کے بعد جنت کی زندگی ہو یا دوزخ کی زندگی ہو سب کا دار و مدار علم کے اوپر ہے۔ اگر ہمیں اس بات کا علم نہ ہو کہ جنت ہے اور ہمیں اس بات کا علم نہ ہو کہ دوزخ ہے تو ہمارے لئے جنت دوزخ دونوں ناقابل تذکرہ ہیں۔

اگر ہمیں اس بات کا علم نہ ہو کہ مرنے کے بعد بھی ہم زندہ رہتے ہیں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی سارے تقاضے اسی طرح کام کرتے ہیں جس طرح دنیا کی زندگی میں کام کرتے ہیں تو عالم اعراف کا تذکرہ نہیں کرینگے۔ اگر ہم قرآن اور آسمانی صحائف اور سیدنا حضور ﷺ کے وارث علماء اور اولیاء اللہ سے ہمیں یہ خبر نہ ملے کہ مرنے کے بعد حساب کتاب ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد انسان کو دو عالموں میں سے کسی ایک عالم میں رہنا پڑتا ہے تو ہمارے لئے موت لایعنی اور بیکار ہو جائے گی اور اس دنیا میں بھلائی اور برائی دونوں کا تذکرہ نہیں

رہے گا۔ برائی اور بھلائی کا تذکرہ اس لئے موجود ہے کہ ہمیں پیغمبروں نے اس کا علم عطا کیا ہے۔ ایک علم وہ ہے جو احتساب اور محنت و مشقت کے بعد کسی میڈیم کا سہارا لے کر حاصل کیا جاتا ہے اس علم کو روحانیت نے علم حصولی کہا ہے یعنی ایسا علم جو شعوری استعداد کے مطابق آدمی سیکھ سکتا ہے لیکن یہ علم بھی خبر متواتر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً ہم ایک دو تین اس لئے کہتے ہیں کہ ایک دو تین کا علم خبر متواتر کی حیثیت سے مسلسل نوع انسانی کو منتقل ہو رہا ہے۔ ہم ایک دو کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ ایک سے پہلے کیا ہے؟ ایک کو آدمی دو کہے اور دو کو ایک کہے تو ہمارے پاس کوئی سند ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ایک واقعی ایک ہے اور دو واقعی دو ہے۔

پرواز

آدم زاد اور بلی کی ماں میں ایک نمایاں فرق ہے وہ یہ کہ آدم زاد کی ماں اپنے بچوں سے کچھ نہ کچھ توقعات وابستہ رکھتی ہے جبکہ بلی اولاد کی پرورش کے تمام تقاضے پورے کر کے ان کو پروان چڑھاتی ہے اور ان سے کوئی توقع نہیں رکھتی۔ اس طرح آدم زاد اور بلی میں ممتاز حیثیت بلی کی ہوئی۔ آدم کی حیثیت مخلوقات میں صرف اس لئے ممتاز نہیں ہے کہ آدم کے ہاں بچے پیدا ہوتے ہیں یا آدم کو بھوک پیاس لگتی ہے یا آدم گرمی سردی سے آشنا ہے۔ یہ سب تقاضے دوسری نوع میں بھی ہیں۔ دیکھا جائے تو بہت سی باتیں عام انسانوں سے ہٹ کر دوسری مخلوقات میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کتے کو پہلے سے علم ہو جاتا ہے کہ بلائیں نازل ہونے والی ہیں جب کہ آدم کو اس بات کا علم نہیں ہوتا۔ پرندوں کو بہت پہلے علم ہو جاتا ہے کہ طوفان آنے والا ہے اور وہ اپنے نئے ٹھکانے پر چلے جاتے ہیں۔ آدمی اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ تو کرتا ہے لیکن جس طرح کبوتر اپنے جسم کے ساتھ آسمان پر اڑ سکتا ہے آدمی نہیں اڑتا۔

جہاں تک نوعی تقاضوں کا تعلق ہے اس میں آدمی اور غیر آدمی تقریباً یکساں کردار ادا کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک چڑیا زندگی گزارنے کے سارے تقاضے رکھتی ہے اور ان تقاضوں کو پورا کرنے کے علم سے بھی باخبر ہے لیکن وہ ہوائی جہاز نہیں بنا سکتی، ایٹم بم نہیں بنا سکتی، ریڈیو یا ٹی وی نہیں بنا سکتی اور آدمی یہ تمام چیزیں بنالیتا ہے۔

اس علم کو ہم وہ علم نہیں کہہ سکتے جو علم اللہ نے بطور خاص آدم کے لئے مخصوص کیا ہے۔ اس لئے کہ اس علم کا تعلق عقل سے ہے۔ جس طرح آدمی ٹی وی بنالیتا ہے چڑیا ٹی وی نہیں بنا سکتی۔ اسی طرح چڑیا آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرتی ہے آدمی پرواز نہیں کر سکتا۔ آدم زاد میں بھی سب لوگ ایسے عاقل اور باشعور نہیں ہوتے جن سے ایجادات ظہور میں آتی ہوں، عقل کی زیادتی یا کمی کی بنیاد پر اختراع و ایجادات قائم ہیں لیکن ایک علم ایسا ہے جو عقل کی حدود سے باہر ہے مثلاً یہ کہ ایک بندہ چڑیا کی طرح اڑ سکتا ہے وہ اڑنے کے لئے وسائل کا محتاج نہیں ہے۔ اولیائے کرام کے ایسے بے شمار واقعات تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں کہ انہوں نے ٹائم اسپیس کی نفی کر کے ہزاروں میل دور کی چیزوں کو دوربین کے بغیر دیکھ لیا اور لاکھوں سال پہلے گزری ہوئی آوازوں کو سنا اور ان کو سمجھا۔

جب بات عقل کی آتی ہے تو عقل بندر میں بھی ہے۔ عقل آدمی میں بھی ہے۔ بندر کی عقل کے مطابق اگر بندر کو علم سکھایا جائے تو وہ سیکھ لیتا ہے۔ انسان کی عقل کے مطابق اس کو جتنے علوم سکھائے جائیں وہ بھی سیکھ لیتا ہے لیکن روحانی علوم کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ روحانی علوم حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آدم کو اپنی ذات کا عرفان ہو۔ اگر انسان اپنی ذات کے عرفان سے بے خبر ہے تو اس کی

حیثیت کتے اور بلی سے زیادہ نہیں ہے۔انسان کے پاس علم الٰہی کا مخصوص عطیہ موجود ہے۔اگر وہ اس مخصوص علم کو نہیں سیکھتا تو یہ اپنے اوپر ظلم ہے۔پیغمبروں کے بعد اس علم کو نوع انسانی کے اوپر منکشف کرنے کا ذریعہ وہ روحانی استاد یا روحانی بزرگ ہیں جن کو اللہ نے اپنا دوست قرار دیا ہے اور جو اللہ کی قربت سے آشنا ہیں۔

لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ

اللہ نے اپنی نیابت اور خلافت کا تذکرہ امانت کے نام سے کیا ہے یعنی خلافت اور نیابت سے متعلق علوم اور ان علوم کے ذریعے کائنات کو تسخیر کرنے کا اختیار آدم کے پاس امانت ہے۔ امانت میں اجازت سے تصرف تو کیا جاسکتا ہے لیکن یہ بات ذہن میں رہتی ہے کہ فلاں چیز ہمارے پاس امانت ہے۔ امانت کا منشاء اور مفہوم یہ ہے کہ آدمی شعوری اور ذہنی اعتبار سے اس بات کو تسلیم کرلے کہ یہ چیز میری اپنی ذاتی نہیں ہے یا اس کا حصول میرا اپنا ذاتی وصف نہیں ہے۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہم نے آدم کو اپنی امانت تفویض کردی اور ہم نے اس کو اختیارات عطا فرمادیئے۔ تاکہ اس امانت کو ہماری مرضی اور ہماری مشیت کے مطابق استعمال کرے۔ علم حضوری اور علم حصولی کے ضمن میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ علم حصولی کا ذریعہ عقل و شعور ہے۔ ایسی عقل اور ایسا شعور جس کو تمام نوع انسانی سمجھ بوجھ کا نام دیتی ہے لیکن بڑی عجیب بات یہ ہے کہ جب ہم عقل و شعور کا فہم اور تدبر سے تجزیہ کرتے ہیں تو عقل و شعور ہمیں بے عقلی، کم فہمی اور بے نظری نظر آتا ہے۔ مثلاً ہم جب شماریات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو شماریات کی پہلی سیڑھی، پہلا قدم یا پہلا حرف ایک ہے۔ جب تک ہم ایک کو ایک نہیں مانتے وہ زیر بحث نہیں آتا اور جب تک ہم دو کو ایک یونٹ تسلیم نہیں کرتے چار کا تذکرہ نہیں ہوتا۔

فہم اور تفکر کا تقاضا یہ ہے کہ ایک سے پہلے کیا تھا۔ عقل و شعور اس بارے میں مجبور اور خاموش ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ بچہ تولد ہوا اس کا نام زید یا بکر رکھا گیا لیکن وہی بچہ آن اور لمحوں میں تبدیل ہو کر جسمانی خدوخال بدل کر ایک ایسا روپ اختیار کرلیتا ہے جس میں بچہ کا بظاہر کوئی روپ نظر نہیں آتا۔ پھر یہی خدوخال اپنے عروج کو پہنچ کر تنزل کرتے ہیں اور آدمی بتدریج ہر آن ہر لمحہ ہر روز ہر ماہ اور ہر سال گھٹتے گھٹتے سمٹتے سمٹتے ایک ایسی شکل اختیار کرلیتا ہے کہ اس شکل کے اندر جھانکنے سے ہمارے اندر جوانی کی کوئی تصویر منعکس نہیں ہوتی۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ آج تولد ہونے والے بچہ کا نام بکر ہے تو اسی (۸۰) سال کے بوڑھے کا نام بھی بکر ہے۔ عقل و شعور کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی کوتاہی اور کتنا بڑا نقص ہے کہ بدلنے والی ہر چیز کا نام ایک رہتا ہے حالانکہ اسی (۸۰) سال کا بوڑھا جس کا نام بکر ہے وہ اسی (۸۰) سال پہلے ایک دن کی عمر کا تھا تو وہ یکسر اسی (۸۰) سال کی عمر سے مختلف تھا۔ سوال یہ ہے کہ جو چیز ساری کی ساری بدل گئی اس کا ایک ہی نام کیسے برقرار رہا۔ عقل کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ایک بچے کو ہم اسکول میں پڑھنے کے لئے بٹھاتے ہیں اس لئے بٹھاتے ہیں کہ بچے کے اندر عقل و شعور پیدا ہو مگر معاشرے نے جس بے عقلی کو عقل کا نام دیا ہے بچے کو اسی بے عقلی سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ اگر یہی بچہ جو

عقل و شعور سے بے خبر ہے عقل و شعور کے دائرے میں رہتے ہوئے استاد سے یہ سوال کر دے کہ الف سے پہلے کیا تھا؟ یا الف ب کیوں نہیں ہے اور ب الف کیوں نہیں ہے؟ تو عقل و شعور کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ چند مفروضات کو مجتمع کر کے ایک گھروندا بنالیا گیا ہے اور اس پر اصرار یہ ہے کہ یہ سب مفروضہ نہیں ہے۔اب یہ کیسی حقیقت ہے کہ جس کی کوئی عملی توجیہہ نہیں ہے۔ بہر کیف ہمیں آنکھیں بند کر کے اور بے عقلی کا مظاہرہ کر کے ان مفروضات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اور جتنا زیادہ کوئی آدمی ان مفروضات کو تسلیم کرتا چلا جاتا ہے اسی مناسبت سے اس کی عملی حیثیت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی شماریات میں پی۔ایچ۔ڈی(Ph.D) کرنا چاہتا ہے یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ Mathematics مفروضوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ تفکر سے کام کیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ ایک بندے نے مفروضات کو اپنے اوپر محیط کر لیا ہے یعنی مفروضات کی دنیا میں ایسی پوزیشن حاصل کر لی ہے جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہیں ہے۔ایسے پڑھے لکھے آدمی کو دانشور(Ph.D) کہا جاتا ہے۔

دنیا کا کوئی فلسفہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ جس چیز کی بنیاد مفروضہ ہے وہ حقیقت بھی ہے۔ مفروضہ یا فکشن کے حصول کے لئے عقل و شعور کا ہونا ضروری ہے اور حقیقت کو پہچاننے کے لئے مفروضہ حواس اور فکشن زندگی کو الگ الگ کرنا ضروری ہے۔ جب کوئی بندہ فکشن سے آزاد نہیں ہوتا وہ حقیقت کی دنیا میں داخل نہیں ہو سکتا۔

روحانی علوم یا دنیاوی علوم میں یہی فرق ہے کہ عقل کسی چیز کو سمجھ کر دیکھ کر اور محسوس کرنے کے بعد تسلیم کرتی ہے لیکن جہاں ایمان کا تذکرہ آتا ہے وہاں آدمی عقل کے ساتھ ایمان اور یقین کا موازنہ کرے تو اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔اس لئے کہ اللہ کریم کو مادی آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا نہ اللہ کریم کو مادی لمس سے چھوا جا سکتا ہے اس لئے کہ اللہ کی ذات اور اللہ کی صفات اور اللہ کے تمام علوم مفروضہ اور فکشن حواس سے ماوراء ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اور اللہ کے نازل کئے ہوئے آسمانی صحائف ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ بندہ اللہ کو دیکھ بھی سکتا ہے اور اللہ کو چھو بھی سکتا ہے اور اللہ کے حضور اپنا عجز و نیاز بھی پیش کر سکتا ہے۔ یہ دیکھنا، یہ محسوس کرنا یہ چھونا اسی وقت ممکن ہے جب آدمی فکشن یا عملِ حصولی کے دائرے سے قدم باہر رکھتا ہے۔

عقل کے دو دائرے ہیں۔ایک دائرہ یہ ہے کہ عقل تو ہے لیکن بندہ اس عقل کو استعمال نہیں کرتا اور جب تک اس عقل کو استعمال نہیں کر لیتا کچھ نہیں سیکھ سکتا۔ دوسرا دائرہ یہ ہے کہ جب بندہ بے عقلی کا مظاہرہ کر کے عقل کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے تو عقل اس کی رہنمائی کرتی ہے اور اس رہنمائی میں وہ طرح طرح کی معلومات اور طرح طرح کے علوم اور طرح طرح کی ایجادات کا موجد بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ عقل حاصل کرنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی علم ہو اس کو سیکھنے کے لئے اپنے علم کی نفی کرنا پڑتی ہے اور آدمی جس مناسبت اور جتنی طاقت سے اپنی نفی کر دیتا ہے اسی مناسبت سے اس کے اوپر علوم کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ وہ علوم مفروضہ ہو یا حقیقی ہوں۔

قانون:

پہلے بندے کو اپنی اور ان علوم کی جو وہ جانتا ہے نفی کرنی پڑتی ہے۔ جیسے ہی وہ اپنی یا اپنے اندر سمائے ہوئے علوم کی نفی کرتا ہے۔اس کے لئے

دوسرے علوم آشکار ہو جاتے ہیں۔ یہ قانون علم حضوری یا علم حصولی دونوں میں نافذ ہے۔ جب کوئی آدمی مسلمان ہوتا ہے تو اسے اس ہستی کی بھی نفی کرنا پڑتی ہے جس ہستی کو وہ اقرار کر رہا ہے یعنی پہلے وہ خدا کا انکار کرتا ہے پھر اقرار کرتا ہے اگر پہلے قدم پر خدا کا انکار نہ کیا جائے تو آدمی مسلمان نہیں ہوتا۔ مسلمان ہونے کے لئے اولین شرط کلمہ طیبہ پڑھنا ہے۔ کلمہ طیبہ میں وہ کہتا ہے:

''لاالہ''

کوئی معبود نہیں۔

''الااللہ''

مگر اللہ۔

پہلے اس نے معبود کی نفی کی پھر اثبات کیا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان ہونے کے لئے اولین شرط ہے کہ آدمی نفی اور اثبات کے قانون سے واقف ہو۔ جب کوئی آدمی

لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ............پڑھتا ہے تو دراصل وہ یہ کہتا ہے کہ میں اس معبود کی اور اس اللہ کی نفی کرتا ہوں جو میرے مفروضہ علوم کے مطابق اللہ ہے۔اور اس اللہ کی تصدیق کرتا ہوں جس اللہ کے بارے میں رسول ﷺ نے شہادت دی ہے۔ رسول اور نبی ہمیشہ مفروضہ حواس سے ماورا ہوتے ہیں۔ وہ حقیقی حواس کے دائرے میں رہتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں۔

لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ مفروضہ اور عقلی حواس سے اپنا رشتہ منقطع کر کے ان حواس میں داخل ہوتا ہوں جو حق آگاہ اور غیب بین استاد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کہنے کے مطابق حقیقی حواس ہیں۔

پر سکون لہریں

غیب بین اور مشاہداتی نظر ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ عقل کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے ہم جو کچھ دیکھتے، سنتے، سمجھتے، چھوتے اور محسوس کرتے ہیں ہمارے پاس کوئی ایسی عملی توجیہہ نہیں ہے کہ ہم اس دیکھنے، سننے، چھونے اور محسوس کرنے کو حقیقی عمل قرار دے سکیں۔ بالآخر جب ہم عقلی اور شعوری دائرے میں رہتے ہوئے کسی عمل کا تفکر اور وجدان کے ساتھ تجزیہ کرتے ہیں تو ہمارے ہاتھ سوائے ٹٹولنے کے کچھ نہیں آتا۔ کسی چیز کو سمجھنے کے لئے بنیادی عمل نظر ہے یعنی جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں تب اس چیز کے بارے میں ہمیں مزید معلومات حاصل کرنے کا تجسس پیدا ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں جب ہمیں کسی چیز کا علم حاصل ہوتا ہے تب بھی یہی صورت حال ہمارے دماغ پر وارد ہوتی ہے کہ ہم اس چیز کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں کہ ہمیں اس چیز کا علم تو حاصل ہو گیا لیکن یہ چیز ابھی نگاہ کے سامنے نہیں آئی۔ جہاں تک نگاہ کا تعلق ہے، سب جانتے ہیں کہ نگاہ کے لئے جب تک کوئی ہدف (Target) نہیں بنے گا، نگاہ اس چیز کو نہیں دیکھتی۔ پس ضروری ہوا کہ دیکھنے کے لئے کوئی ہدف قائم ہو اور جس ہدف پر نگاہ ٹھہرے اس کے اوصاف دماغ کی اسکرین پر منعکس ہوں۔

قانون:

نگاہ وہی کچھ دیکھتی ہے جو دماغ کے اوپر منعکس ہوتا ہے۔ اس کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ دماغ وہی کچھ محسوس کرتا ہے جو نگاہ دماغ کے اوپر منتقل کرتی ہے۔ دیکھنے کی طرزوں میں تفکر ہماری رہنمائی کرتا ہے جو کچھ ہم دیکھتے ہیں اس کی معنوی اور حقیقی حیثیت ہوتی ہے اور دوسری بات یہ کہ وہ چیز حقیقت سے کتنی دور یا قریب ہے۔ علم حصولی کے دائرے میں نظر کا کام مفروضہ یا فکشن ہے۔ مفروضہ اور فکشن حواس سے مراد یہ ہے کہ اس چیز میں تغیر اور ردوبدل واقع ہوتا رہے۔

علم حضوری کے اندر جو نگاہ کام کرتی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ علم حضوری کی نگاہ جو کچھ دیکھتی ہے اس میں تغیر نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر کسی روحانی مسافر نے فرشتہ کو دیکھا ہے وہ اگر سو سال کے بعد بھی فرشتہ کو دیکھتا ہے تو فرشتہ میں اسے کوئی تغیر نظر نہیں آتا۔ وہ کسی روح کو دیکھتا ہے جب بھی دیکھتا ہے روح اپنے خدوخال کے اعتبار سے وہی نظر آتی ہے جو وہ دیکھ چکا ہے۔

اس کے برعکس ایک آدمی ''بکر'' کو جوانی کی عمر میں دیکھتا ہے۔ دس سال کے بعد جب اس کو دیکھتا ہے اس کے خدوخال میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ ردوبدل اور تغیر میں دیکھنا شعوری حواس کا کام ہے اور اس ماورائی دنیا میں دیکھنا جس میں تغیر نہیں ہے لاشعوری حواس

کا دیکھنا ہے۔ بات کچھ اس طرح بنی کہ زندگی میں دیکھنے کی دو طرزیں ہیں۔ ایک طرز بالواسطہ اور ایک طرز براہ راست ہے۔ بالواسطہ دیکھنا شعوری نظر ہے اور براہ راست دیکھنا لاشعوری نظر ہے۔ شعوری نظر مفروضہ اور فکشن ہے اور لاشعوری نظر غیر مفروضہ اور حقیقت ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی فکشن نظر کی نفی کر کے اس نظر کو حاصل کرلے جو حقیقت کو دیکھتی ہے۔ ایک چیز سے گزر کر دوسری چیز میں داخل ہونا یا ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز کو حاصل کرنا اس وقت ممکن ہے جب ہم چھوڑنے والی چیز سے اپنا تعلق عارضی طور پر یا غیر مستقل طور پر منقطع کرلیں۔ اس رشتے کو منقطع کرنے کا نام روحانیت میں نفی کرنا ہے اور جب آدمی اپنی نفی کرتا ہے تو اس کے سامنے مشیت آجاتی ہے۔

مراقبہ کا عمل اپنی نفی کرنے کے لئے پہلا سبق ہے۔ صاحب مراقبہ ایک ایسا طریقہ کار اختیار کرتا ہے جس کی کوئی شعوری توجیہہ پیش نہیں کی جا سکتی۔ بجز اس کے کہ مراقبہ کرنے والے بندہ کے اندر بیک وقت دو نگاہیں کام کرتی ہیں۔ ایک نگاہ محدود ہے جو میڈیم (Medium) کے بغیر نہیں دیکھتی۔ دوسری نگاہ غیر محدود ہے اور اس کو کسی میڈیم کی ضرورت نہیں ہے۔ میڈیم سے مراد اسپیس ہے۔ گوشت پوست کی آنکھ اسپیس کے دائرے سے باہر نہیں دیکھ سکتی اگر آنکھ کے سامنے سے اسپیس حذف کر دیا جائے تو کچھ نظر نہیں آتا اور اس کا تجربہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ ایک نقطہ پر آنکھ کو اس طرح مرکوز کر دیا جائے کہ آنکھ کے ڈیلوں کی حرکت اور پلک جھپکنے کا عمل ساکت ہو جائے اس طرح نظر کے سامنے خلا اور روشنی کے سوا کوئی چیز نہیں آئے گی۔

قانون:

فکشن حواس میں دیکھنے کی طرز یہ ہے کہ ڈیلا حرکت کرتا ہے اور پلک جھپکتی ہے۔ اگر کسی آدمی کی پلکیں باندھ دی جائیں تو چند سیکنڈ کے بعد اس کے سامنے اندھیرے کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ یعنی ڈیلوں کے اوپر پلک جھپکنے کے عمل کے ساتھ ساتھ ہلکی ضرب پڑتی ہے وہی باہر سے آنے والے عکس کو دماغ پر منتقل کرتی ہے۔

مثال:

ایک کیمرہ ہے۔ اس کے اندر فلم ہے۔ کیمرے میں نہایت عمدہ لینس (Lense) فٹ ہیں۔ فلم کے اوپر عکس منتقل ہونے کے لئے جتنی روشنی کی ضرورت ہے فضا میں وہ روشنی موجود ہے۔ کیمرے کے لینس کو ہم آنکھ کہتے ہیں اور کیمرے کے اندر فلم کو ہم دماغ یا حافظہ کی اسکرین کہتے ہیں۔ لینس کے اوپر جو بٹن لگا ہوا ہے اس کو ہم پلک جھپکنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب تک کیمرے کے اندر لگا ہوا بٹن یا کیمرے کی پلک نہیں جھپکے گی یا حرکت میں نہیں آئے گی، فلم پر فوٹو منعکس نہیں ہوگا۔ اسی طرح جب تک آنکھ کے ڈیلوں کے اوپر آنکھ جھپکنے کا عمل صادر نہیں ہوگا۔ دماغ کی اسکرین پر کوئی نقش نہیں ابھرے گا۔ موجودہ سائنس کی روشنی میں ایک منظر کا عکس دماغ کی اسکرین پر تقریباً پندرہ سیکنڈ تک قائم رہتا ہے۔ پندرہ سیکنڈ تک قائم رہنے کا مطلب یہ ہے کہ عکس پہلے ہلکا ہوتا ہے پھر کچھ واضح ہوتا ہے پھر اور زیادہ

روشن ہوتا ہے۔ پھر دھندلا ہو کر ریکارڈ بن جاتا ہے۔ پندرہ سیکنڈ گزرنے سے پہلے دوسرا عکس منتقل ہو جاتا ہے۔ اگر ہم پلک جھپکنے کے عمل کو مسلسل پندرہ سیکنڈ تک بار بار ساکت کریں تو ایک ہی نقش دماغ کی اسکرین پر منتقل ہوتا رہتا ہے۔

جب کوئی بندہ آنکھیں بند کر کے مراقبہ میں بیٹھتا ہے تو اس صورت میں پلک جھپکنے کا عمل اور پتلی کی حرکت کا عمل جاری رہتا ہے۔ آنکھیں اگر بند ہوں تو عارضی طور پر پلک جھپکنے کا عمل تو ساکت ہو جاتا ہے لیکن پتلی کی حرکت اپنی جگہ موجود رہتی ہے اور پتلی کی حرکت کے ساتھ ساتھ پپوٹے بھی متحرک رہتے ہیں۔ پپوٹوں کے متحرک رہنے سے مراد یہ ہے کہ پلک کی حرکت ابھی جاری ہے یعنی دماغ کے اوپر عکس بندی کا عمل ہو رہا ہے۔ مراقبہ کرنے والا بندہ ایک نقطے پر اپنے ذہن کو مرکوز کر دیتا ہے اور وہ نقطہ ''تصور شیخ'' ہے یعنی وہ دیکھنے کی اجتماعی صلاحیتوں کو شیخ کے تصور میں مجتمع کر دیتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ایک ہی عکس پانچ منٹ، دس منٹ، پندرہ منٹ تسلسل کے ساتھ دماغ کے اوپر منتقل ہوتا ہے۔

قانون:

جو عکس دماغ کی اسکرین پر منتقل ہوتا ہے اس عکس کے اندر موجود صلاحیتیں، صفات اور خاصیتیں بھی دماغ کے اوپر منتقل ہوتی ہیں اور دماغ انہیں محسوس کرتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی آگ دیکھتا ہے جیسے ہی آگ کا عکس دماغ کی اسکرین پر منتقل ہوتا ہے، آدمی کے اندر حرارت اور گرمی کی خاصیت پیدا ہوتی ہے۔ ایک آدمی سرسبز و شاداب درختوں کے باغ میں موجود ہے، رنگین پھولوں کی خاصیت یعنی ٹھنڈک دماغ کو منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح جب شیخ کی شبیہہ دماغ کی اسکرین پر منتقل ہوتی ہے تو شیخ کے اندر جو علم حضوری کام کر رہا ہے وہ بتدریج دماغ میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔

اعتراف

ہو جا۔ کیا ہو جا؟

ہو جا کہنے والی ہستی کے ذہن میں جو پروگرام ہے وہ روحانی طور پر وجود میں آجائے جب یہ ہو جا روحانی مظاہرات اور خدوخال کی شکل میں وجود میں آگیا تو لاعلمی کو علم میں بدلنے کے لئے ہو جا کہنے والی ہستی نے خود کو روحانی مظاہراتی دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ ہم جانتے ہیں کہ نظر اس وقت کام کرتی ہے جب نظر کے لئے کوئی مرکزیت ہو۔ اس دنیا میں آنے کے بعد مرکزیت میں تبدیلی واقع ہوئی لیکن قانون اپنی جگہ بحال رہا۔ جس طرح حقیقت دماغ کی اسکرین پر منتقل ہوتی ہے اسی طرح عارضی حواس بھی دماغ کی اسکرین پر منتقل ہوتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ عارضی کیفیات ہمیں پابند حواس میں قید رکھتی ہیں اور تصور شیخ کا مراقبہ اس امر کی کوشش ہے کہ کسی ایک ہستی کو مرکزیت بنا کر بار بار دماغ کی اسکرین پر منتقل کیا جائے جتنا زیادہ ایک خیال دماغ کی اسکرین پر منعکس ہوتا ہے اسی مناسبت سے دماغ میں ایک پیٹرن بن جاتا ہے اور یہی پیٹرن تصوف کی اصطلاح میں ''طرز فکر'' ہے۔ ہم جب روحانی استاد یا شیخ کا تصور کرتے ہیں تو ازلی قانون کے مطابق شیخ کے اندر کام کرنے والی اللہ کی صفات کا علم بار بار ہمارے دماغ کے اوپر وارد ہوتا ہے اور جیسے جیسے شیخ کے اندر کام کرنے والی روشنیاں سالک کے اندر منتقل ہوتی ہیں سالک کا ذہن شیخ کی روشنیوں سے منور ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ شیخ اور مرید ایک نقطے پر قائم ہو جاتے ہیں۔ تصوف میں اسی حالت کو نسبت کہا جاتا ہے۔ روحانیت میں نسبت حاصل کرنے کا اہم ذریعہ محبت اور عشق ہے۔ سالک کے اندر جس حد تک محبت اور عشق کی لہریں موجزن ہوتی ہیں اسی مناسبت سے اسے شیخ کا ذہن منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ شیخ کے اندر کام کرنے والی روشنیاں جو دراصل اللہ کی تجلیات ہیں سالک کو منتقل ہو جاتی ہیں۔ سالک ان انوار اور تجلیات سے متعارف ہو جاتا ہے۔ اس حالت یا کیفیت کو فنافی الشیخ کہا جاتا ہے۔ شیخ کی روشنیاں اور شیخ کے اندر کام کرنے والے انوار و تجلیات شیخ کا اپنا ذاتی وصف نہیں ہے۔ جس طرح ایک سالک اپنی تمام تر توجہ اور ذہنی ارتکاز کے ساتھ شیخ کے علم اور شیخ کی صفات کو اپنے اندر منتقل کر لیتا ہے۔ اسی طرح شیخ نے اپنی تمام تر توجہ اور ذہنی ارتکاز کے ساتھ سیدنا حضور ﷺ کے علم اور صفات کو اپنے اندر منتقل کیا ہے۔

فنافی الشیخ کی حالت میں شیخ کے اندر کام کرنے والی وہ صلاحیتیں سالک کے اندر بیدار اور متحرک ہو جاتی ہیں جن صلاحیتوں کی بنیاد پر شیخ کے اندر سے سیدنا حضور ﷺ کی نسبت منتقل ہوتی ہے۔ اس ہی مقام کو فنافی الرسول کہا جاتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں تمہاری طرح کا بشر ہوں مگر میرے اوپر وحی آتی ہے۔ بشریت کے دائرے سے باہر ہو کر اگر دیکھا جائے تو حضور ختم المرسلین ﷺ کی

فضیلت یہ ہے کہ ان کے اوپر وحی نازل ہوتی ہے۔ یہ وحی خدا کی طرف سے آتی ہے اور سیدنا حضور ﷺ کے ذہن مبارک پر علوم لدنی، انوار اور تجلیات الٰہی منعکس ہوتی ہیں۔ فنا فی الرسول کے بعد کوئی سالک قدم بہ قدم محبت، عشق اور گداز کے ساتھ حضور ﷺ کے علوم کا عارف ہوتا رہتا ہے اور ایک سعید وقت ایسا آتا ہے کہ حضور ﷺ کے علوم سالک کو اس کی استعداد کے مطابق منتقل ہو جاتے ہیں۔ جتنی استعداد کسی سالک کے اندر موجود ہے اس ہی مناسبت سے وہ حضور ﷺ کی صفات میں جذب ہو جاتا ہے اور حضور ﷺ کی نسبت اور ہمت سے اس مقام میں جا ٹھہرتا ہے جس مقام میں اس نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ ''جی ہاں'' آپ میرے رب ہیں۔

اس نسبت کو تصوف میں وحدت کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر توفیق ملے تو وہ مقامات کھلتے ہیں جن کے بارے میں کچھ لکھنا یا بتانا شعوری سکت سے باہر ہے۔ یہ سب بیان کرنے کا منشاء یہ ہے کہ انسان کے دماغ میں ایک اسکرین ہے جس کے اوپر بغیر وقفے کے عکس منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر عکس کی معنویت جدا جدا ہے۔ اگر عکس کی یہ منتقلی علم حصولی کے دائرے میں ہے تو یہ علم مفروضہ اور فکشن ہے اور اگر اس علم کی منتقلی علم حضوری کے دائرے میں ہے تو عکس کے اندر موجود علم حقیقت پر مبنی ہوتا ہے لیکن قانون اپنی جگہ قانون ہے کہ جب تک ذہن انسانی پر کوئی نقش منتقل نہیں ہوتا انسان کی نظر اور فہم کام نہیں کرتی۔

جادو

روحانی علوم جو روحانی اولاد کو منتقل ہوتا ہے وہ بالکل اس ہی طرح ہے جس طرح ایک باپ کی دنیاوی دولت اولاد میں تقسیم ہوتی ہے۔ جس طرح مادی طریقہ کار کے بعد اولاد کو ماں باپ کی طرز فکر منتقل ہوتی ہے۔ اولاد دنیاوی جاہ و جلال، دولت و عزت اور جواہرات کی متلاشی ہوتی ہے اور دنیا کو اہمیت دیتی ہے۔ بالکل اس کے برعکس روحانی باپ کی اولاد کے نزدیک دنیا اور زر و جواہر کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، وہ صرف اس حد تک دنیا میں دلچسپی لیتا ہے کہ اس کی دنیاوی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ ضروریات پوری ہونے میں بھی اس کے اندر یہ یقین مستحکم ہو جاتا ہے کہ ضروریات کا کفیل اللہ ہے۔ اس کے برعکس وہ طرز فکر جس میں دنیا کی محبت ہو اس میں روحانی قدریں موجود نہ ہوں، استاد یا گرو سے علوم تو منتقل ہوں مگر ایسے علوم جو روحانیت کے دائرہ کار میں نہ آتے ہوں اور طرز فکر بنیادی طور پر دنیاوی ہو، تصوف کی اصطلاح میں استدراج کہلاتی ہے۔ استدراجی علوم وہ ہوتے ہیں جن کے اندر شیطانیت اور ذریت ابلیس کی طرز فکر موجود ہو اور وہ علوم جو ایسے استاد سے منتقل ہوتے ہیں جس کی طرز فکر میں دنیا مفروضہ اور فکشن کے علاوہ کچھ نہیں روحانی علوم کہلاتا ہے۔

روحانی علوم کی دو طرزیں ہیں ایک استدراج اور ایک علم حضوری۔ وہ تمام علوم جو آدمی شیطانی طرز فکر اور شیطانی صلاحیتوں کو بیدار کر کے حاصل کر لیتا ہے، استدراج ہے۔ روحانی علوم کی طرح استدراجی علوم بھی بطور ورثہ منتقل ہوتے ہیں۔

استدراج حاصل کرنے کے لئے بھی ذکر و اشغال کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس علم کو حاصل کرنے کے لئے بھی محنت و مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور بڑی بڑی ریاضتیں کرنی پڑتی ہیں۔

علم حضوری حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے مجاہدے اور بڑی بڑی ریاضتیں کرنی پڑتی ہیں۔ جس طرح ایک روحانی آدمی سے کوئی کرامت صادر ہوتی ہے اسی طرح ایک ایسے آدمی سے خرق عادت صادر ہوتی ہے جو استدراجی علوم کا وارث ہے۔ استدراجی اور شیطانی علوم سے خرق عادت کا صادر ہونا اور حضوری یا انبیاء کے علوم کے تحت کسی خرق عادت کا صادر ہونا قرآن پاک سے ثابت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں اس بات کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

فرعون نے اپنے ملک کے تمام ماہر جادوگروں کو طلب کیا اور ایک مقررہ دن حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلے کے لئے مقرر ہوا۔ ایک بڑے میدان میں علوم استدراج کے ماہرین اور جادوگر جمع کئے گئے۔ اس میدان میں موسیٰ علیہ السلام بھی موجود تھے۔ سوال کیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پہل آپ کی طرف سے ہوگی یا ہماری طرف سے ہوگی؟ جلیل القدر موسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

اے جادو گر! تم پہل کرو۔

جادو گروں نے رسیاں پھینکیں جو سانپ بن گئیں اور بانس پھینکے جو اژدھا بن گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سانپ اور اژدھوں کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ اللہ کریم نے ارشاد فرمایا:

اے موسیٰ! ڈرنے اور غمگیں ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تیرے ساتھ ہوں تو اپنا عصاء پھینک دے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصاء زمین پر ڈال دیا جو ایک بڑے اژدھے میں تبدیل ہو گیا اور اس نے میدان میں موجود تمام سانپوں اور اژدھوں کو نگل لیا اور اس طرح علم استدراج کے ماہرین جادو گروں پر علم حضوری کو فتح حاصل ہوئی لیکن یہ بات محل محال نظر ہے کہ جادو گروں نے رسی پھینکی تو سانپ بنے اور جادو گروں نے بانس پھینکے تو اژدھا بنے اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی پھینکی تو وہ اژدھا بن گئی۔ فرق اگر کچھ ہے تو وہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی ایک لاٹھی اتنا بڑا اژدھا بن گئی کہ اس نے میدان میں موجود بے شمار سانپوں اور اژدھوں کو نگل لیا۔ لیکن جہاں تک جادو گروں کی خرق عادت یا جادو کا تعلق ہے ان کی رسیاں بھی سانپ بن گئیں اور موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی بھی اژدھا بن گئی۔ فرق صرف یہ نظر آتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جادو گروں پر غلبہ حاصل ہوا اور اللہ کی نصرت ان کے شامل حال رہی۔ اس بات کو ذرا آسان الفاظ میں بیان کیا جائے تو اس طرح کہا جائے گا کہ علوم کا یقین دونوں درجوں میں ہوتا ہے۔ ایک درجہ یہ ہے کہ اس علم کی بنیاد زر پرستی، جاہ طلبی اور دنیاوی عزت و وقار ہے اور دوسرے درجے میں علم حق کی تعریف یہ ہے کہ علم حق ماسوائے اللہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ علم حق والا بندہ جو کچھ دیکھتا ہے جو کچھ سنتا ہے وہ حق کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے پیش نظر ناموری نہیں ہوتی۔ اس کے پیش نظر زر پرستی نہیں ہوتی۔ اس کے پیش نظر دنیاوی لالچ نہیں ہوتا۔ اس کے ذہن میں کبھی یہ بات نہیں آتی کہ مجھ سے کوئی ایسی خرق عادت صادر ہو جس کی وجہ سے لوگ مرعوب ہوں اور میری عزت کی جائے۔ اس کے برخلاف استدراج والوں کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کارنامے دکھا کر دنیا حاصل کرتے ہیں۔ اس کی سند بھی قرآن پاک سے ملتی ہے۔

فرعون نے جادو گروں کو طلب کر کے کہا:

اگر تم نے موسیٰ کو زیر کر دیا تو میں تمہیں مالا مال کر دوں گا اور تمہیں اپنا مصاحب بنا لوں گا۔

اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ جادو گروں نے جادو کے ذریعے جو کارنامے انجام دیئے اس کے پیچھے دنیاوی اغراض اور دنیا پرستی تھی۔

جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو میدان میں آنے سے پہلے اس قسم کی کسی بات کا خیال تک نہیں تھا۔ محض حق کے غلبے کے لئے اور اللہ کی عظمت و جبروت کو ظاہر کرنے کے لئے اور یہ بتانے کے لئے کہ شیطانی علوم، علوم حق کے سامنے باطل ہیں، کمزور اور جھوٹے ہیں میدان میں تشریف لے آئے۔ اللہ کا یہ ارشاد کہ ڈرمت اپنی لاٹھی پھینک دے۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ جادو گروں نے میدان میں جادو جگایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے لئے پہلے سے تیار نہ تھے۔ محض اللہ کے بھروسے پر ان بڑے بڑے طاقتور جادو گروں کے سامنے

جا کھڑے ہوئے اس کے علاوہ جادو گروں نے جو رسیاں پھینکی تھیں ان کے سانپ بن گئے تھے۔ یہ سب فریب اور فکشن تھا۔ اس لئے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی نے ان کو نگل لیا تو ان کا وجود ختم ہو گیا جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصاء پر ہاتھ ڈالا تو ان کے ہاتھ میں دوبارہ عصاء آیا۔

معجزے اور جادو میں یہ فرق ہے کہ جادو کی تخلیق اور جادو کا مظاہرہ عارضی ہوتا ہے۔

قانون:

حقیقت تبدیل نہیں ہوتی، حقیقت رہتی ہے۔ جادو کے زور سے بنے ہوئے سانپ اور جادو کے زور سے بنے ہوئے اژدھے سب نیست و نابود ہو گئے اور موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی موجود رہی۔ اس واقعہ سے روحانی شاگردوں کے لئے یہ انکشاف ہوا کہ طرز فکر اگر غیر حقیقی ہے تو عارضی ہے۔ طرز فکر اگر حقیقی ہے تو حقیقت ہے۔ حقیقت میں ردوبدل نہیں ہوتا۔ ایک استاد یا گرو اپنے چیلے کو جب استدراجی علوم سکھاتا ہے اور یہ علوم سکھانے کے لئے چیلے کے اندر اپنی طرز فکر منتقل کرتا ہے تو وہ چیلہ گرو تو بن جاتا ہے لیکن حقیقت سے دور رہتا ہے۔ اور جب کوئی بندہ پیغمبروں کی طرز فکر سے علوم حاصل کرتا ہے تو حقیقت آشنا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ حقیقت، حقیقت سے گلے مل لیتی ہے۔ تاریخ میں ایک بھی ایسی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ایسے بندے نے جو حقیقی طرز فکر کا حامل تھا علم استدراج کی طرف رجوع کیا ہو اور ایسی ہزار ہا مثالیں موجود ہیں کہ علم استدراج کے بڑے بڑے ماہر اور دانشوروں نے اسلام کی حقانیت کو قبول کر کے شیطانی علوم سے اپنا ذہن صاف کر کے حق آشنا اور حق پرست بن گئے۔

مرشد کریم، استاد یا گرو کی طرح ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ استاد کے اندر طرز فکر کونسی کام کر رہی ہے اور اس طرز فکر کا تعلق شیطانیت سے ہے یا اس طرز فکر کی رسائی حق پر ہے۔ جس طرز فکر کی رسائی حق پر ہے وہی طرز فکر بندے کو اللہ سے متعارف کرواتی ہے اور ایسا بندہ ہی راہ سلوک میں قدم قدم چل کر اللہ کو دیکھ لیتا ہے۔ اللہ سے ہم کلام ہو جاتا ہے اور اللہ کا دوست بن جاتا ہے۔

ایسا دوست جس کے اندر خوف اور غم نہیں ہوتا۔

ماحول

انسان کا کردار اس کی طرز فکر کی تعمیر کرتا ہے۔ طرز فکر میں پیچ ہے تو کردار بھی پیچیدہ بن جاتا ہے۔ طرز فکر سادہ ہے تو بندے کی زندگی میں سادگی داخل ہو جاتی ہے۔ طرز فکر اگر سطحی ہے تو بندہ سطحی طریقہ پر سوچتا ہے۔ طرز فکر میں اگر گہرائی ہے تو بندہ ہر چیز کے اندر گہرائی تلاش کرنے کے لئے تفکر کرتا ہے۔ اللہ کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے میں اسی طرز فکر کی نشاندہی کی ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی موجودگی میں ایک فرد واحد کی سوچ الگ ہے اور اس سوچ میں حقیقت پسندی اور گہرائی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے میں اس بات کی طرف اشارہ موجود ہے کہ ایک خاص طرز فکر کے لوگوں میں رہتے ہوئے بھی طرز فکر الگ ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت پسندانہ طرز فکر کہاں سے منتقل ہوئی۔ جب کہ پورے ماحول میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت پسندانہ طرز فکر ہر آدمی کے اندر موجود ہے لیکن ہر آدمی اسے استعمال نہیں کرتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بت پرست لوگوں نے پوچھا کہ ان خداؤں کو کس نے توڑا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا اپنے خداؤں سے پوچھ لو۔ لوگوں کے سامنے یہ بات آگئی تھی کہ بت اپنی مرضی اور منشاء استعمال نہیں کر سکتے اور انہیں توڑا جا سکتا ہے لیکن ان کے اندر پھر بھی حقیقت پسندی نے حرکت نہیں کی۔

روحانی راستے کے مسافر کی طرز فکر میں تبدیلی اس طرح ہوتی ہے کہ روحانی استاد یا پیر و مرشد بتدریج اپنے شاگرد سے اس قسم کی باتیں کرتا ہے جو اس کے ماحول میں موجود نہیں ہوتیں یا ماحول میں رہنے والے لوگ اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ مرشد کریم مرید کے اندر اس بات کو راسخ کر دیتا ہے کہ جو چیز مفروضہ ہے اس کو حقیقت نہیں کہا جا سکتا۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ باوجود اس کے کہ آدمی خود کو بااختیار سمجھتا ہے۔ زندگی کے شب و روز میں کہیں بھی اس کو اختیار نہیں ہے۔ پیدا اپنے اختیار سے نہیں ہوتا۔ پیدائش کے بعد بالکل غیر اختیاری طور پر بڑھتا ہے۔ جوانی کے بعد نہ چاہنے کے باوجود بوڑھا ہو جاتا ہے۔ دنیا کا ایک فرد واحد بھی یہ نہیں چاہتا کہ وہ مر جائے۔ لیکن جو آدمی پیدا ہوتا ہے وہ مرتا ضرور ہے۔ آدمی کو اس بات پر تو اختیار ہے کہ وہ غذائی ضروریات کو کم یا زیادہ کر لے لیکن اس پر دسترس نہیں ہے کہ وہ ساری زندگی کھانا نہ کھائے یا ساری زندگی نہ پانی پیئے یا ہفتوں مہینوں بیدار رہے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو ہر لمحے میں آدمی کے ساتھ چپکی ہوئی ہیں۔ لمحات، گھنٹے، دن، مہینے اور سالوں، یہ تغیر ایک ایسا تغیر ہے جس سے کوئی باہوش آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ ان تمام تغیرات کی نشاندہی کر کے مرشد کریم بتاتا ہے کہ اس تغیر کے پیچھے یہ حقیقت چھپی ہوئی ہے کہ کوئی ذات ایسی ہے جس کے ہاتھ میں اس تغیر و تبدل کی ڈوریاں ہیں اور وہ ہاتھ ان ڈوریوں کو جس طرح حرکت دیتا ہے زندگی میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ سالک جب دن رات ایسے مشاہدات سے

گزرتا ہے جن کے اوپر غیر روحانی آدمیوں نے پردہ ڈالا ہوا ہے تو اس کا ذہن خود بخود اس قادر مطلق ہستی کی طرف رجوع ہو جاتا ہے جس ہستی نے تغیر و تبدل کی ڈوریاں سنبھالی ہوئی ہیں۔

طرز فکر کا یہی بیج ہے جو مرشد کریم دماغ میں بو دیتا ہے پھر اس بیج کو پروان چڑھانے کے لئے مرشد مزید جدوجہد اور کوشش کرتا ہے۔ وہ ایسے برگزیدہ حضرات کو سامنے لاتا ہے جن کی طرز فکر میں حقیقت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مثلاً وہ اپنے تصرف سے مرید کو خواب کی ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جس دنیا میں اولیاء اللہ اور پیغمبروں کی زیارت اسے نصیب ہوتی ہے۔ مسلسل اور متواتر خوابی مشاہدے کے بعد اس کا رخ اولیاء اللہ اور پیغمبروں کی طرف مڑ جاتا ہے اور اس کی طرز فکر پر ایسا رنگ چڑھ جاتا ہے جو رنگ اولیاء اللہ اور پیغمبروں کے لئے مخصوص ہے۔

اس کی باطنی آنکھ پر مرشد کریم ایسی عینک لگا دیتا ہے کہ عینک کے اندر لگے ہوئے شیشے اس کو وہی کچھ دکھاتے ہیں جو مرشد کریم کی طرز فکر ہے۔ مثلاً عینک کے اندر جس رنگ کے گلاس لگے ہوتے ہیں آدمی کو وہی رنگ نظر آتا ہے۔ عینک کے گلاس اگر نیلے ہیں تو ہر چیز نیلی نظر آتی ہے۔ گلاس اگر سرخ ہیں تو ہر چیز سرخ نظر آتی ہے۔ گلاس اگر صاف شفاف اور مجلیٰ ہیں تو اسے چیزیں صاف شفاف اور مجلیٰ نظر آتی ہیں۔ عینک کے شیشے اگر دھندلے ہیں تو ہر چیز دھندلی نظر آتی ہے اور اگر عینک کے شیشے اندھے ہیں تو عینک کے شیشے آنکھ پر لگانے کے باوجود آنکھ اندھی رہتی ہے، کچھ نظر نہیں آتا حالانکہ عینک لگانے کے بعد آنکھ کھلی رہتی ہے۔

رنگ دراصل طرز فکر ہے۔ عینک کے اندر جس قسم کی طرز فکر کا گلاس فٹ کر دیا جاتا ہے وہی طرز فکر کام کرتی ہے۔ عینک کے اندر شیشہ اتنا صاف اور مجلّیٰ بھی ہوتا ہے کہ آدمی میلوں دور کی چیز دیکھ سکتا ہے اس کے برعکس عینک میں لگا ہوا گلاس اتنا اندھا بھی ہوتا ہے کہ عینک لگانے کے بعد آدمی کو اتنا بھی نظر نہیں آتا جتنا کہ عینک لگائے بغیر نظر آتا ہے۔

دیکھنا، چیزوں کی ماہیت معلوم کرنا، تفکر کرنا ہر آدمی کے اندر موجود ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہمیں ان صلاحیتوں کا استعمال نہیں آتا۔ مرشد چونکہ تفکر کی صلاحیتوں کے استعمال کو جانتا ہے اور اس کی زندگی تفکر سے تعمیر ہوئی ہے اس لئے مرید کے اندر جب مرشد کی صلاحیت منتقل ہوتی ہے تو تفکر کا بویا ہوا بیج آہستہ آہستہ تناور درخت بن جاتا ہے۔

اس بیج کو تناور درخت بننے میں جو چیز رکاوٹ بنتی ہے وہ آدمی کا اپنا ذاتی ارادہ اور عقل ہے۔ کوئی بندہ جب اپنی ذات کو سامنے لے آتا ہے اور عقل کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے تو اسے کامیابی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس کے اندر جو شعور کام کرتا رہا ہے اس کا تعلق اس طرز فکر سے ہے جس طرز فکر میں گہرائی اور حقیقت پسندی نہیں ہے۔

سخاوت

عام مشاہدہ ہے کہ بچہ جو زبان بولتا ہے اس زبان کو سیکھنے کے لئے درس و تدریس کا کوئی سلسلہ قائم نہیں کیا جاتا۔ بچہ جس طرح ماں باپ کو بولتے ہوئے دیکھتا ہے وہی الفاظ بولنا شروع کر دیتا ہے۔ عمر کی مناسبت سے لفظ ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں لیکن بالآخر وہ اپنی مادری زبان اس طرح بولتا ہے کہ جیسے یہ ہمیشہ سے سیکھا سکھایا پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ والدین جس طرح خورد و نوش کرتے ہیں بچہ بھی اس طرح کھانا کھاتا ہے۔ ماحول اگر پاکیزہ اور صاف ستھرا ہے تو بچے کا ذہن بھی پاکیزہ اور صاف ستھرا رہتا ہے۔ والدین اگر گالیاں بکتے ہیں تو گھر میں بچے کے لئے گالیاں دینا کوئی خلاف معمول یا بری بات نہیں ہوتی۔ بچے کے اوپر وہ تمام اثرات مرتب ہوتے ہیں جو اس کے ماحول میں موجود ہیں۔ گھر کی چار دیواری اور ماں کی آغوش سے نکل کر بچہ جب باہر کے ماحول میں قدم رکھتا ہے تو اس کے اوپر وہ تمام اثرات مرتب ہوتے ہیں جو ماحول میں موجود ہیں۔

روحانی نقطہ نظر سے دنیا میں ہر پیدا ہونے والا فرد آدھا ماحول کے زیر اثر تربیت پاتا ہے اور آدھا والدین کی تربیت کے مطابق۔

اس غیر اختیاری تربیت کے بعد ایک دوسرا دور شروع ہوتا ہے وہ یہ کہ والدین اپنے لخت جگر کو کیا بنانا چاہتے ہیں۔ والدین اگر بچے کے اندر خود نمائی کی عادات منتقل کر دیتے ہیں تو بچے کے اندر خود نمائی کے اثرات غالب آ جاتے ہیں۔ والدین اگر بچے کی صحیح تربیت کے ساتھ ایسے علوم سکھاتے ہیں جن علوم میں اخلاقیات کا زیادہ اثر ہوتا ہے تو بچہ بااخلاق ہوتا ہے اور شعور کی منزل میں داخل ہو کر ایسا پیکر بن جاتا ہے جو معاشرے کے لئے عزت و توقیر کا باعث ہوتا ہے۔ والدین کی طرز فکر اگر دولت پرستی ہے تو اولاد کے اندر دولت پرستی کے رجحانات زیادہ مستحکم ہو جاتے ہیں۔

تربیت کے دو طریقے ہیں۔ ایک غیر اختیاری اور دوسرا اختیاری۔ غیر اختیاری طریقہ یہ ہے کہ بچہ جو کچھ گھر کی چار دیواری اور ماحول میں دیکھتا ہے اسے قبول کر لیتا ہے۔ اختیاری صورت یہ ہے کہ والدین اسے مخصوص تربیت کے ساتھ معاشرے سے روشناس کراتے ہیں اور جب یہ بالغ فرد ہو جاتا ہے تو اس کی اپنی ایک شخصیت بن جاتی ہے۔

کسی بندے کے کردار کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ اسے ایک مخصوص طرز فکر حاصل کرنے کے لئے ویسی ہی قربت حاصل ہو جس طرح ایک فرد کے لئے ماحول، والدین، رشتے دار اور تعلیمی درسگاہ قربت کا ذریعہ بن کر اس کے کردار کی تشکیل کرتے ہیں۔ اسی طرح روحانی آدمی کے کردار کی بھی تشکیل ہوتی ہے اور وہ اس طرح ہوتی ہے کہ اسے ایسے کسی بندے کی قربت حاصل ہو جاتی ہے جس کا کردار

روحانی قدروں پر محیط ہے۔ مراد کا کردار عوام الناس سے اور ان لوگوں سے جو روحانی حقیقتوں سے بے خبر ہیں، ممتاز ہوتا ہے۔ اس شخصیت سے جس حد تک قربت ہوتی جاتی ہے اسی مناسبت سے مرید کے اندر روحانی اوصاف منتقل ہوتے رہتے ہیں اور مراد کی طرز فکر کا ایک جزو مرید کے دماغ کی اسکرین پر نقش ہو جاتا ہے۔ اس طرز فکر کا نام ''سلوک'' ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر کوئی سالک اپنے اندر موجودہ روحانی قوتوں سے متعارف ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں بیان کردہ پیغمبروں کی زندگی اور پیغمبروں کے مشن سے یہ بات واضح ہے کہ پیغمبروں نے ایک مخصوص طرز فکر کا پرچار کیا ہے۔ پیغمبرانہ اوصاف سے ہر بندہ برائی اور اچھائی میں تمیز کر سکتا ہے یعنی پیغمبروں نے نوع انسانی کو اچھائی اور برائی کے تصور سے آشنا کیا ہے۔ دوسری مخلوق پر انسان کو اس لئے ممتاز حیثیت حاصل ہے کہ انسان اچھائی اور برائی کے تصور سے واقف ہے۔ اسے اس بات کا علم دیا گیا ہے کہ زندہ رہنے کے لئے مخصوص طرز فکر انسان کو اچھا بناتی ہے اور زندہ رہنے کے لئے دوسری طرز فکر انسان کو اچھائی سے دور کر دیتی ہے۔ اچھائی کے تصور کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی انسان کا علم بن جاتی ہے کہ اچھا فرد وہ ہے جو اپنی اصل سے باخبر ہے۔ اصل سے باخبری اسے ایک ایسے علم سے روشناس کراتی ہے کہ جو علم اسے اپنے اندر کام کرنے والی مخفی صلاحیت سے واقف کر دیتا ہے۔ مخفی صلاحیتیں جس مناسبت سے استعمال کی جاتی ہیں اتنا ہی اس کا کردار مصفی اور پاکیزہ ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس آدمی اپنے اندر جس حد تک مخفی صلاحیتوں سے ناواقف ہے اسی مناسبت سے اس کا کردار دھندلا رہتا ہے۔

ایک بکری اور انسان کی زندگی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو بکری اور انسان ایک ہی طرح کی زندگی گزارتے ہیں۔ انسان کو جو صلاحیت بکری سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنے اندر موجود مخفی صلاحیتوں سے واقف ہو جاتا ہے اور اگر کوئی انسان ان مخفی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہے یا اسے اپنی ذات کا عرفان حاصل نہیں ہے تو وہ بکری یا کسی دوسرے جانور سے ممتاز نہیں ہے۔ مخفی صلاحیتوں سے واقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اسے ایسے باپ کی آغوش میسر ہو جس کے اندر مخفی علوم کا دریا موجزن ہو اور اسے ایسا ماحول میسر ہو جس ماحول میں پاکیزگی ہو۔ باپ سے مراد استاد یا مرشد ہے۔ ماحول سے مراد مرشد کی روحانی اولاد ہے۔ بچے کا شعور والدین کی گود، گھر کی چار دیواری اور ماحول سے بنتا ہے۔ ماحول میں اگر کثافت، تعفن، گھٹن، بے سکونی اور اضطراب ہے تو بچہ بھی ذہنی طور پر سکون سے ناآشنا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر گھر میں سکون ہے، آرام ہے، والدین کی آواز میں مٹھاس ہے، لہجے میں پیار ہے اور دماغی اعتبار سے والدین پرسکون ہیں تو بچہ بالکل غیر اختیاری طور پر پرسکون کردار کا حامل ہوتا ہے۔ یہ بات ہمارے مشاہدے میں ہے کہ چیخ کر بولنے والے والدین کے بچے بھی چیخ کر بولتے ہیں۔ ندیدے اور لالچی والدین کے بچے بھی ندیدے اور لالچی ہوتے ہیں۔ کبر و نخوت کے پیکر والدین کے بچوں کے اندر غرور اور تکبر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ضدی اور سرکش والدین کے بچے ضدی اور سرکش ہوتے ہیں۔ حلیم الطبع ماں باپ کی اولاد حلیم طبیعت ہوتی ہے۔ سخی والدین کی اولاد عام طور پر سخی ہوتی ہے۔

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے سامنے جب جنگی قیدیوں کی فہرست پیش کی گئی تو ایک خاتون کے نام کے ساتھ طائی لکھا ہوا تھا۔ تحقیق کرانے سے معلوم ہوا کہ یہ خاتون حاتم طائی کے قبیلے کی ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کی رہائی کا حکم صادر فرمایا۔

خاتون کو جب رہائی کی نوید سنائی تو طائی خاتون نے آزاد ہونے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ بات میرے خاندانی روایت کے خلاف ہے کہ میں آزاد ہو جاؤں اور میرا قبیلہ قید و بند کی صعوبت برداشت کرے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کو جب اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے طائی خاتون کے ساتھ پورے طائی قبیلے کو انعام و اکرام کے ساتھ آزاد کر دیا۔ پیغمبروں کی زندگی کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اللہ نے مخصوص کردار کے لوگوں کا ایک سلسلہ قائم کیا ہے اور جو لوگ اس سلسلے سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور ان کی وابستگی قربت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے ان کے اندر بھی وہی قدریں منتقل ہو جاتی ہیں جو اس مخصوص کردار کے مقدس لوگوں کا حصہ ہیں۔ راہ سلوک پر چلنے کے لئے سالک کو کسی شخص کا ہاتھ پکڑنا اس لئے ضروری ہے کہ اسے ایک روحانی باپ کی شفقت میسر آجائے اور اس روحانی باپ کی اولاد کا بھرپور ماحول میسر آجائے اور ذہنی تربیت ہو جائے۔

ثواب و عذاب

ایک آدمی طبعی طور پر کتنا ہی خشک کیوں نہ ہو جب وہ ایسی جگہ جاتا ہے جہاں رنگ و روشنی کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں اور گانوں کے اونچے نیچے سروں سے فضا معمور ہوتی ہے تو بالآخر وہ بندہ گانے بجانے میں دلچسپی لینے لگتا ہے اور گانے بجانے کے آداب سے واقف ہو جاتا ہے۔ جو آدمی ایسے ماحول میں رہتا ہے جس ماحول میں جوا، سٹہ، لہو و لعب کی دنیا آباد ہے وہ بندہ کتنا ہی صاف ستھرا ہو بالآخر وہ متاثر ہو جاتا ہے۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔

دنیا میں جتنے لوگ آباد ہیں ان کا تعلق مخصوص طرز فکر سے ہے اور طرز فکر کی بنیاد پر ہی کسی گروہ، کسی ذات، کسی برادری اور کسی کردار اور کسی شخص کا تعین کیا جاتا ہے۔ ہمارے سامنے پیغمبروں کا بھی کردار ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ان لوگوں کا کردار بھی ثابت ہے جنہوں نے پیغمبروں کی مخالفت کی اور انہیں قتل کیا۔ تاریخ کے صفحات میں ایسے لوگوں کا کردار بھی موجود ہے جس میں سخاوت عام ہے اور ایسے کردار بھی موجود ہیں جن میں کنجوسی اور بخیلی اپنی معراج کو پہنچی ہوئی ہے۔ کنجوسی اور بخیلی کے کردار کا باوا آدم قارون ہے۔ جب تک دنیا قائم رہے گی قارون کی ذریت اور قارون کے کردار سے متاثر لوگ موجود رہیں گے اور جب تک دنیا موجود ہے سخی لوگ موجود رہیں گے۔ دنیا میں پیغمبروں کے کردار کے حامل لوگ بھی موجود ہیں۔ پیغمبروں کے کردار کو جب ہم خوردبینی نظروں سے دیکھتے ہیں تو ہمیں اچھائی کے علاوہ کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی یعنی وہ ایسے کردار سے مستفیض ہیں جس کردار میں لطافت حلاوت کے علاوہ کوئی دوسری چیز شامل نہیں ہے۔ کردار کے تعین میں دو طرزیں بنتی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی شیطانیت سے قریب ہو کر شیطان بن جاتا ہے اور دوسری یہ کہ آدمی سراپا رحمت بن جاتا ہے اور اللہ کی بادشاہت میں نمائندہ بن جاتا ہے۔ وہ تمام طرزیں جو بندے کو اللہ سے دور کرتی ہیں شیطانی طرزیں ہیں اور وہ تمام طرزیں جو بندہ کو اللہ سے قریب کرتی ہیں پیغمبرانہ طرزیں ہیں۔ پیغمبرانہ طرزوں اور شیطانی طرزوں کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ جو بندہ رحمانی طرزوں میں داخل ہو جاتا ہے اس کے اندر پیغمبروں کے اوصاف منتقل ہو جاتے ہیں۔ پیغمبروں کے اوصاف اللہ کے اوصاف ہیں۔ یعنی جب کوئی بندہ پیغمبرانہ زندگی میں سفر کرتا ہے تو دراصل وہ ان صفات میں سفر کرتا ہے جو اللہ کی ذاتی صفات ہیں اور جب کوئی بندہ ان پیغمبرانہ صفات سے منہ موڑ لیتا ہے تو ان راستوں میں بھٹکتا پھرتا ہے جو تاریک اور کثافت سے معمور ہیں۔ شیطانی طرز یہ ہے کہ آدمی کے اوپر خوف اور غم مسلط رہتا ہے۔ ایسا خوف اور غم جو زندگی کے ہر قدم کو ناقابل شکست و ریخت زنجیروں میں جکڑے رکھتا ہے۔ دن ہو یا رات خوف میں بسر ہوتا ہے کبھی اسے زندگی ضائع ہونے کا قلق و غم ہوتا ہے کبھی وہ معاشی ضروریات کے پورا نہ ہونے کے خوف میں مبتلا رہتا

ہے کبھی اس کے اوپر بیماریاں حملہ آور ہوتی ہیں اور کبھی وہ وسائل کے انبار میں اس طرح دب جاتا ہے کہ اسے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ موت جس کو بہر حال آنا ہے اس کے اوپر خوف بن کر مسلط ہو جاتی ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ موت سے کسی بھی طرح رستگاری نہیں ہے۔ شیطانی طرزوں میں ایک بڑی قباحت یہ ہے کہ آدمی ذہنی اور نظری طور پر اندھا ہوتا ہے اور یہی اندھا پن اسے دردناک عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

پیغمبرانہ طرزوں میں آدمی کے اوپر خوف اور غم مسلط نہیں ہوتا تو عدم تحفظ کے احساس سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ موت چونکہ ایک اٹل حقیقت ہے اس لئے مرنے کے لئے تیار رہتا ہے اور جب وہ مرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے تو موت اس کے لئے دنیا کی سب سے زیادہ خوش نما چیز بن جاتی ہے۔ اسے اس بات کا سراغ مل جاتا ہے کہ موت کوئی بھیانک عمل نہیں ہے بلکہ موت ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہونے کا نام ہے۔ جس طرح وہ رنگ و بو کی دنیا میں زندگی کے تقاضے پُر کرتا ہے اسی طرح مرنے کے بعد کے عالم میں بھی زندہ رہتا ہے۔ روحانی اور جسمانی تمام ضروریات پوری کرتا ہے اور یہ بات محض اس کے قیاس میں داخل نہیں ہوتی بلکہ وہ اس شگفتہ زندگی کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ ایک طرز فکر کے آدمی دوسری طرز فکر کے آدمیوں سے ممتاز رہتے ہیں۔ شیطانی طرز فکر میں زندگی گزارنے والا بندہ انبیاء کے گروہ میں داخل نہیں ہوتا اور انبیاء کی طرز فکر سے آشنا بندہ شیطانی گروہ میں داخل نہیں ہوتا۔ شیطانی طرز فکر میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ بندہ ہر عمل اس لئے کرتا ہے کہ اس عمل کے پیچھے کوئی نہ کوئی لالچ یا دنیاوی مفاد ہوتا ہے یعنی وہ عمل کرنے کا مادی صلہ چاہتا ہے۔ تصوف ایسے عمل کو جس عمل کے پیچھے کوئی غرض وابستہ ہو ناقص قرار دیتا ہے۔